یورپ کے تاثرات

"یہ کتاب صرف حالات و واقعات اور مشاہدات و تجربات کا مجموعہ نہیں ہے بلکہ اس میں زندگی کے کچھ نئے راستے معلوم ہوتے ہیں۔ ہمیں اِس کتاب میں ایسی قوم کے حالات کا پتہ چلتا ہے جو ہم سے کسیطرح بالا و برتر نہیں لیکن اِس میں کچھ ایسی قومی خصوصیات اور منضبط اور مربوط زندگی کے کچھ ایسے پہلو ہیں جن سے ہم اس زمانہ میں بے خبر رہ سکتے اور نہ بے خبر رہنا چاہیئے۔

اِس میں شک نہیں کہ یہ بڑی دلچسپ کتاب ہے لیکن اِس میں دلچسپی سے زیادہ بصیرت و عبرت کا سامان ہے۔ مجھے یقین ہے کہ قومی تعمیر و تشکیل کے خاکہ میں یورپ کی زندگی کی یہ چند تصویریں مفید ثابت ہونگی۔"

ڈاکٹر سید عبد اللطیف

یورپ کے تاثرات

(یعنی پچیس فرزندان وطن کے مشاہدات و تجربات کا مرقع)

تالیف

محمد بدرالدین خان شکیب بی۔ اے۔ ال ال۔ بی وکیل ہائیکورٹ

مطبوعہ

اعظم اسٹیم پریس حیدرآباد دکن

۱۳۴۹ ف

بار اول

۱۲۵۰

ملنے کے پتے:-
سید عبدالقادر اینڈ سنس تاجران کتب چار مینار۔
مکتبۂ ابراہیمیہ عابد روڈ
کتاب خانۂ اُردو عابد روڈ
دیگر مشہور تاجران کتب حیدرآباد دکن۔

مُلک کے نوجوانوں کے نام

فہرست مضامین

پیش لفظ

یُورپ باوجود رنگ ونسل کے امتیازات کے کئی حیثیتوں سے ایک ایسی اقلیم ہے جو ایک ناظر کے دل پر دیرپا اِرتسامات اور نقوش بٹھاتی ہے۔ وہاں کے حیرت انگیز سائنس کے اِکتشافات اور مادّی ترقیوں نے اہلِ یورپ کی معاشی، اخلاقی اور سیاسی زندگی اور اس کے نصب العینوں میں اِتنا زبردست اِنقلاب برپا کردیا ہے کہ یورپ کی حیاتِ اجتماعی مختلف پیچیدہ اور عالمگیر اہمیّت رکھنے والے مسائل کا مظہر بن گئی ہے۔ ہندوستان کا جو بخت واتفاق سے یورپ کی ایک طاقتور سلطنت کے زیرِ اقتدار رہے اِن جدید خیالات اور رجحانات سے متصادم ہونا ناگزیر تھا۔

یہ کتاب اُن اِرتسامات کا مجموعہ ہے جو ایسے فرزندانِ وطن کے دلوں پر منقوش ہوئے ہیں جنھیں یورپ میں کسی نہ کسی حیثیت سے رہنے سہنے اور اپنے اپنے زاویۂ نظر سے اُس کو سمجھنے کا موقع ملا ہے۔ مسٹر بدر شکیب نے اِس بات کا اہتمام کیا ہے کہ اس میں ہر نقطۂ نظر کے لوگ شامل رہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اِس میں ماہرینِ تعلیم بھی ہیں، سیاس بھی ہیں، اَدیب ہیں، سائنس داں ہیں، بیرسٹر ہیں، ڈاکٹر ہیں۔ غرض ہر قسم کے لوگ ہیں جس سے

کتاب کی افادیت میں اضافہ ہو گیا ہے۔ بظاہر ان ارتسامات کا ہر شخص کے طبعی رجحان، جبلی صلاحیت اور ذہانت کی بنا پر آپس میں مختلف ہونا ضروری ہے۔ لیکن یہ مسرت کا مقام ہے کہ مرتب نے اپنے ذوق نظر سے ایسے اصحاب کا انتخاب کیا جو بحیثیت مجموعی یورپ کی زندگی اور حالات کا ایک مربوط اور متناسب نقشہ پیش کر سکتے تھے۔ اس لحاظ سے یہ مجموعہ صحیح معنوں میں ایک مفید اور دلکش مرقع ہے۔

مسٹر بدر شکیب جامعہ عثمانیہ کے اُن قابل فرزندوں میں سے ہیں جنھوں نے اپنے ذوق اور صلاحیت کی تربیت سے ملک کے اُن مسائل پر جو اہل فکر کی توجہ کا مرکز بنے ہوئے ہیں، جچی تلی نظر پیدا کر لی ہے۔ اُنھوں نے رائے کے اظہار میں ہر صاحب بیان کو اپنے حال پر نہیں چھوڑا بلکہ بڑی دانائی اور احتیاط کے ساتھ فکر اور رائے کے دائرہ کو چند سائنٹفک حدود میں متعین کر دیا جو ان ارتسامات کے افادی قدر و قیمت کی ضامن ہیں۔ جو سوالات اُنھوں نے ہر صاحب بیان کے سامنے پیش کئے اور جن موضوعات پر تبادلۂ خیال اور بحث و تمحیص کی ان سے بجائے خود زندگی کا ایک زاوئیہ نظر ظاہر ہوتا ہے اور یہ معلوم ہوتا ہے کہ یورپ کی منزل مقصود کیا ہے اور ہندوستان کیا چاہتا ہے۔ دراصل ایک مقصد کی تلاش ہے جس کے نشانات ناظرین اس کتاب کے ہر صفحہ پر پائینگے۔

یہ کتاب صرف حالات و واقعات اور مشاہدات و تجربات کا مجموعہ نہیں ہے۔ بلکہ اس میں زندگی کے کچھ نئے راستے معلوم ہوتے ہیں۔ ہمیں اس

کتاب میں ایسی قوم کے حالات کا پتہ چلتا ہے جو ہم سے کسی طرح بالا و برتر نہیں لیکن اس میں کچھ ایسی قومی خصوصیات اور منضبط اور مربوط زندگی کے کچھ ایسے پہلو ہیں جن سے ہم اس زمانہ میں بے خبر رہ سکتے اور نہ بے خبر رہنا چاہیئے۔

اِس میں شک نہیں کہ یہ بڑی دلچسپ کتاب ہے۔ لیکن اِس میں دلچسپی سے زیادہ بصیرت و عبرت کا سامان ہے۔ مجھے یقین ہے کہ قومی تعمیر و تشکیل کے خاکہ میں یورپ کی زندگی کی یہ چند تصویریں مفید ثابت ہونگی۔

حیدرآباد دکن | (ڈاکٹر) سیّد عبداللطیف پی۔ ایچ۔ ڈی (لندن)

تعارف

میں نے یورپ کی کبھی سیر نہیں کی۔ اُس کے جلوے دور ہی سے دیکھے ہیں۔ اِس لحاظ سے مجھے نقوشِ یورپ کے اِس دل نشین مجموعہ پر قلم اٹھانے کا بہت کم حق حاصل ہے۔ لیکن میں اپنے دوست بدر شکیب کی فرمائش اور ایک نامعلوم سی ترغیب کو کسی طرح ٹال نہیں سکتا۔

ہمارے ملک میں یورپ کے تعلیم یافتہ افراد کی کمی نہیں جن کی ایک بڑی تعداد نظم و نسق کے سانچوں میں ڈھلی جا رہی ہے۔ اِس کارخانے سے یقیناً کبھی کبھی اچھی صنعتیں بھی نکلتی رہتی ہیں لیکن عام طور پر آشنایانِ فرنگ کی خوش نما ٹولیوں میں ایسے لوگ خال خال ہی نظر آئینگے جنھوں نے اپنے آپ کو پبلک زندگی اور اُس کے قریبی مسائل سے وابستہ کیا ہو یا ملک کے وسائلِ حیات میں اِضافہ کرنے کے لئے کوئی نئے ہمت آزما میدان اپنے لئے پیدا کئے ہوں۔ اس کی وجہ بہ ظاہر یہی معلوم ہوتی ہے کہ بہت سی مستعار امانتیں، ترقی کے اَن گنت اِمکانات اور نئی تہذیب کی بے پناہ قوتیں دیر تک شانِ مجاز میں اِن کے جِلو میں رہتی ہیں۔ کبھی وہ سوسائٹی سے اِس قدر اُونچے ہو جاتے ہیں کہ اُن کی نظر عام نظروں سے مل نہیں سکتی اور کبھی وہ اپنے اندر ایک نئی نوع کے وجود کا اِحساس اِس قدر قوی پاتے ہیں کہ جب وہ بولتے ہیں تو اُنکی

بُولی کسی کے سمجھ میں نہیں آتی پھر حجابات کچھ اُٹھنے لگتے ہیں لیکن اُس وقت جبکہ زمانہ عمل سے زیادہ ردِعمل اور خیال سے زیادہ ردِ خیال کا ہوتا ہے۔ اس دَور میں خود ہی کو کچھ سوجھ جائے تو سوجھ جائے لیکن اوروں کو کوئی کیا سمجھا سکے۔

یورپ کی تماشاگاہ سے بہت سے تماشائی کچھ اِسی آن سے لوٹے اور اِسی ڈھب کی زندگی بسر کی لیکن اُنھیں میں بعض ایسے اربابِ نظر بھی ہیں جنھوں نے کچھ دیکھا اور جو کچھ وہاں دیکھا ہمیں بھی دکھانے کی کوشش کی۔ کچھ حاصل کیا اور جو بھی اِس خاکِ رواں سے اُنہیں مِلا ہمیں بھی دینے کی کوشش کی۔

اِس مجموعہ میں کچھ ایسے ہی ''دیدہ وروں'' کی جھلکیاں نظر آتی ہے۔ اِن میں بعض ایسے بھی ہیں جو ابھی نیم باز آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں۔

یوُرپ ایک عجیب سرزمین ہے جہاں تہذیب کے نت نئے نظام بنتے اور بگڑتے ہیں اور معاشرت کے گوناگوں تجربات آئے دن آزمائے جاتے ہیں۔ زندگی کی سطحی اور گہری چیزیں، کثیف و لطیف رجحانات بہ یک وقت آپس میں دست وگریبان نظر آتے ہیں۔ ایک پُر لطف مشغلہ چپکے چپکے ایک سنجیدہ مسئلہ بن جاتا ہے پھر یہی عالمانہ سنجیدگی کسی کے ہاتھوں ایک دلچسپ مشغلہ میں تحلیل ہو کر رہ جاتی ہے۔ زندگی ایک منظم کھیل ہے جس کو سو طرح سے کھیلا جاتا ہے لیکن اس سے کون انکار کر سکتا ہے کہ ہر ایسے یا اِسی قسم کے عمل میں ایک ''طریقہ'' کارفرما رہتا ہے جسکا مقصد کوئی نہ کوئی مادّی نتیجہ خیزی ہے۔ یہاں فکر و دانش ہے، حکمت و تدبیر ہے، علم و فن ہے، عمل و تنظیم ہے، سلیقہ ہے، حُسن ہے اور اُس کی آرائش ہے لیکن دیکھنا یہ ہے کہ اِن

مظاہر حیات میں سب کو ہم آہنگ کرنے والی رُوح کس طرح کام کر رہی ہے۔ یورپ نے قدرت کی بہت سی اَن بوجھ قوتوں کو اپنا رفیق بنا لیا لیکن کیا وہ زندگی کے کسی دُور رس مستقبل کو پہچان سکا۔ اس کی بے شمار ترقیوں میں ہماری مجبوریوں کا بھی کچھ حال کھُل سکتا ہے؟

یہ ایک سوال ہے جو مختلف انداز سے یورپ کے تربیت یافتہ صاحبوں سے کیا جا سکتا ہے۔ اِسی سوال کو بدر شکیب نے اپنے متجسس دماغ کی روشنی میں حل کرنے کی کوشش کی ہے۔ شکیب کی زندگی سوچ بچار، اخلاص اور گہرے اِحساس سے لپٹی ہوئی ایک عمل کی زندگی ہے۔ وہ ہمیشہ کچھ کرنا اور کام کا راستہ نکالنا چاہتے ہیں۔ یہ کتاب دراصل اُن کی اِسی کوشش کا ایک نتیجہ ہے۔

میں چاہتا ہوں کہ لوگ اِس کتاب کو ذرا غور سے پڑھیں!

حیدر آباد دکن — سید معین الدین قریشی

۲۲ آبان ۱۳۴۸ف

دیباچہ

ہندوستان پر یورپ کے تمدنی اور تہذیبی اثرات یوں تو ایسٹ انڈیا کمپنی کے زمانہ ہی سے شروع ہو گئے تھے لیکن ان میں شدت ہندوستان پر انگریزی تسلط کے بعد پیدا ہوئی اور غدر کے بعد سے اَسی سال کے قلیل عرصہ میں مغربی تہذیب ہماری زندگی کے ہر شعبہ میں سرایت کر گئی۔ ہماری معاشرت ہمارے سیاسی اور سماجی تصورات، ہمارے قانونی اور معاشی آئین، ہماری زبان، ہمارا ادب، غرض ہماری ہر چیز آج مغربی اثرات کی رہین منت ہے اور مغرب نے ان پر وہ گہرے نقوش چھوڑے ہیں کہ ان کے محو ہونے کیلئے بڑا عرصہ لگے گا۔ اِس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ ہماری تہذیب و تمدن کسی طرح مغربی تہذیب و تمدن سے کمتر ہے بلکہ بظاہر اس کے یہ اسباب معلوم ہوتے ہیں کہ جب دو قومیں یا تمدن آپس میں متصادم ہوتے ہیں تو غالب قوم کا تمدن مغلوب قوم کے تمدن پر چھا جاتا ہے اور اگر بدقسمتی سے احساس پستی بھی رُونما ہو جائے تو یہ اثرات زیادہ گہرے اور نمایاں ہو جاتے ہیں۔ ہر زمانہ میں اِس قسم کی مثالیں ملتی ہیں۔

لیکن تعجب اِس امر کا ہے کہ مغرب کے اُن سارے اثرات کو قبول

کرنے کے باوجود ہم میں ابھی وہ خصوصیات پیدا نہیں ہوئیں جو مغربی اقوام کے لیئے سرمایۂ ناز ہیں اور جو اُن کی ترقی کا اصلی سبب ہیں۔ اِس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ ہم نے اُن اثرات کا تجزیہ کرنے کی کبھی کوشش ہی نہیں کی اور اگر کی بھی ہے تو بہت کم۔

اِس وقت حیدرآباد میں یُورپ سے واپس شدہ حضرات کی اتنی کثیر تعداد موجود ہے کہ شاید ہی ہندوستان کے کسی شہر میں ہو اور ہر سال اِس تعداد میں اضافہ ہی ہوتا جارہا ہے لیکن اِس کے باوجود ہم دیکھ رہے ہیں کہ ملک کو اِن لوگوں سے کوئی خاطرخواہ فائدہ نہیں پہنچ رہا ہے۔ ایک طرف یُورپ جانا آجکل بڑی حد تک محض اپنے ذاتی فائدہ کی غرض سے ہوتا ہے تو دوسری طرف ملک کا ماحول اور فضا، ایسی ہے کہ کام کرنے والوں کو اپنے جوہر دکھانے کا موقع ہی نہیں ملتا۔ اُن کی قابلیتیں گھٹ کر رہ جاتی ہے۔ اُن پر جو قومی دولت صرف ہوتی ہے وہ رائیگاں جاتی ہے۔ اِس کے کیا اسباب ہیں۔ اِس کے کون ذمہ دار ہیں اور اس کی کیسے اِصلاح ہو سکتی ہے۔ ایسے سوالات ہیں جن کا یہاں جواب دینا میرے موضوع سے خارج ہے۔ میں نے اِس کتاب میں صرف یہ معلوم کرنے کی کوشش کی ہے کہ ہمارے مقابلہ میں یورپ اِتنا ترقی یافتہ کیوں ہے۔ اہل یورپ میں آخر وہ کونسی خصوصیات ہیں جن کی وجہ سے وہ ہم پر فوقیت رکھتے ہیں اور جن کا ہم میں پیدا ہونا ضروری ہے تاکہ ہم بھی زندہ اقوام کی صف میں آسکیں۔ ہم میں کونسی کمزوریاں ہیں

بیانات اِس کتاب کی زینت ہیں۔ جن اصحاب کے بیانات میں نے قلمبند کئے ہیں اُن کا انتخاب میں نے اپنے طور پر کیا ہے۔ میں نے صرف ایسے اصحاب کے بیانات حاصل کرنے کی کوشش کی ہے جو واقعتاً اپنے دل میں قومی درد رکھتے ہیں جنہوں نے یورپ کے حالات کا گہری نظر سے مطالعہ کیا ہے اور جو ذہن و کردار کے لحاظ سے ملک کی قابلِ احترام ہستیاں ہیں۔ یہ حیدرآباد کے بہترین دماغ ہیں اور یہ کسی بھی ملک یا صوبہ میں رہتے تو اس کے لئے مایۂ ناز ثابت ہوتے۔ اِس میں شک نہیں کہ ان میں سے بعض گمنامی میں ہیں لیکن اِس کی وجہ بجز اِس کے کچھ نہیں کہ اُنہوں نے گمنامی میں رہنا پسند کیا ورنہ اس زمانہ میں شہرت پروپگنڈے کا دوسرا نام ہے۔

اِس کتاب میں جملہ پچیس اصحاب کے بیانات ہیں جن میں سے دو بیرون حیدرآباد کے ہیں۔ علاّمہ عبداللہ یوسف علی اور سید حسین۔ میں نے کوشش کی تھی کہ باہر کے مشہور لوگوں اور رہنمایانِ قوم کے کچھ اور بیانات حاصل کروں اور اس سلسلہ میں میں نے ہندوستان کے تقریباً تمام رہنمایان قوم کے نام خطوط روانہ کئے تھے لیکن گاندھی جی، ڈاکٹر ٹیگور اور سر شاہ سلیمان کے سوا جنہوں نے اپنی مصروفیتوں کی بناء پر معذرت چاہی کسی نے خط کا جواب دینے کی بھی ضرورت محسوس نہیں کی۔ علاّمہ عبداللہ یوسف علی جشن جوبلی کی تقریب میں اور ڈاکٹر سید حسین تقریری سفر کے سلسلہ میں بلدہ تشریف لائے تھے۔ علامہ موصوف نے اپنے وعدہ کے بموجب لاہور سے اپنا بیان روانہ فرمایا اور ڈاکٹر صاحب نے اس امر کی اجازت دی کہ ان کی تقاریر سے میں

ان کا بیان مرتب کر لوں۔ مجھے اس کا بھی افسوس ہے کہ خود حیدر آباد کے بعض لوگ رہ گئے ہیں۔ اس کی وجہ کچھ تو میری اپنی مصروفیتیں ہیں اور کچھ "پیروی" سے گھبرا جانا۔ اگر حالات اجازت دیں اور وقت ملے تو میں آئندہ اس کی تلافی کرنے کی کوشش کرونگا۔ جو بیانات اِس کتاب میں شائع ہو رہے ہیں ان میں سے اکثر محض گفتگو (inter views) کی تفصیل ہیں بعض بیانات تحریری تھے جنھیں میں نے اپنے طور پر لکھ لیا۔ بعض انگریزی کے ترجمے ہیں۔ مثلاً علامہ عبداللہ یوسف علی۔ ڈاکٹر لطیف سعید۔ ڈاکٹر جے سوریا اور ڈاکٹر رضی الدین کے بیانات۔ جو بیانات زبانی حاصل کئے گئے تھے ان میں سے تقریباً تمام میں نے "صاحب بیان" کو دکھلائیے ہیں مبادا افراط و تفریط کی ذمہ داری مجھ پر عاید ہو۔ میں نے خاص طور پر کوشش کی ہے کہ بیانات میں میری جانب سے کوئی اضافہ یا ترمیم نہو۔ لہذا بیانات میں جو بھی خیالات ظاہر کئے گئے ہیں وہ صاحب بیان کے اپنے خیالات ہیں جن سے مجھے کوئی تعلق نہیں۔ میری حیثیت محض ایک راوی کی ہے۔

بیانات کی ترتیب میں نے سنہ واری رکھی ہے یعنی جو صاحب یورپ پہلے گئے ہیں اُن کو پہلے جگہ دی گئی ہے۔ یہ طریقہ مجھے اس لئے پسند آیا کہ اس میں یورپ کے حالات کا اِرتقائی اور تدریجی طور پر اندازہ کرنے مین آسانی ہوتی ہے۔

آخر میں میں اُن تمام اصحاب کا ممنون ہوں جن کے بیانات اِس کتاب کی زینت ہیں کہ اُنہوں نے میری اِستدعا پر ملک و قوم کو اپنے خیالات اور مشاہدات

سے مستفید ہونے کا موقع دیا۔ اپنے احباب میں میں خاص طور پر مولوی سید محمد صاحب ایم۔ اے اور مولوی سید محمدؐ اکبر صاحب وفا قانی بی۔ اے۔ ال ال۔ بی کا شکرگزار ہوں کہ ان کے مفید مشوروں اور رہنمائی سے مجھے بڑی مدد ملی۔

یکم آبان ۱۳۴۸ف

بدر شکیب

بیت الامیر

ملے پلی جدید حیدرآباد دکن

علامہ عبداللہ یوسف علی

علامہ عبداللہ یوسف علی ایم۔ اے۔ ال ال۔ ایم (کنٹب) آئی۔ سی۔ ایس۔ سی۔ بی۔ ای کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ آپ کی شہرت بین الاقوامی ہے۔ انڈین سیول سرویس سے آپ کا تعلق سنہ ۱۸۹۵ء سے سنہ ۱۹۱۴ء تک رہا۔ یہاں سے وظیفہ لینے کے بعد آپ سنہ ۱۷ء تا سنہ ۱۹ء اسکول آف اورنٹیل اسٹڈیز لندن میں ہندوستانی زبانوں، مذاہب و تہذیب کے لکچرار مقرر ہوئے۔ سنہ ۲۱ء میں حکومت سرکار عالی نے آپ کی خدمات بحیثیت صدر المہام مال حاصل کیں۔ اِس کے بعد صدر المہامی صنعت و حرفت پر آپ فائز ہوئے۔ لیکن سنہ ۲۲ء میں اپنی خدمت سے مستعفی ہو گئے۔ آجکل آپ اِسلامیہ کالج لاہور کے پرنسپل ہیں۔ آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کی سنہ ۱ء میں اور خلافت کانفرنس کی سنہ ۲۵ء میں آپنے صدارت بھی فرمائی ہے۔

آپ انگریزی کے ایک مسلّمہ ادیب اور کئی بلند پایہ کتب کے مصنف ہیں۔ آپ کا قرآن مجید کا انگریزی ترجمہ جس کے کچھ حصے چھپ کر شائع ہو چکے ہیں کلام پاک کا ایک بہترین و مُستند ترجمہ ہے۔

اِختلافات

یورپ کی زندگی کے متعلق اپنے تاثرات کو ایک مختصر مضمون میں بیان کرنا آسان نہیں ہے۔ یورپ ایک بڑا رقبہ ہے۔ اور اُس میں متعدد ممالک شامل ہیں جن میں سے ہر ایک کی زبان جُداگانہ ہے اور قومی زندگی مختلف۔ ایک ملک کے حالات سے دوسرے ملک کے حالات میں اِتنا زبردست اِختلاف پایا جاتا ہے کہ کل یورپ کی ایک ہی تصویر کھینچنے سے کوئی مفید نتیجہ برآمد نہیں ہو سکتا۔ اِس لئے میرے لئے شاید یہی بہتر ہوگا کہ میں برطانیہ عظمیٰ کے متعلق اپنے تاثرات قلمبند کر دوں۔ یہاں بھی اِختلافات ہیں لیکن اتنے زیادہ نہیں ہیں جتنے کہ اُن مجموعۂ خیالات میں پائے جاتے ہیں جنھیں سوویٹ کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے اور اُن مجموعۂ خیالات میں جو جرمنی میں نازی حکومت کے زیر سایہ پرورش پا رہے ہیں۔

ہندوستانی و برطانوی زندگی کا مقابلہ

ہندوستانی زندگی کے مقابلہ میں برطانوی زندگی کی پہلی چیز جو نمایاں طور پر نظر آتی ہے وہ بحیثیت مجموعی ایک منضبط قومی زندگی کا وجود ہے۔ اِنگلستان، اِسکاچستان، ویلز اور شمالی آئرستان ایک دوسرے سے مختلف رقبے ہیں۔ ویلز کے اندرونی علاقوں میں جو زبان بولی جاتی ہے وہ ولش ہے نہ کہ انگریزی اور یہ معیاری انگریزی زبان سے جس سے کہ ہم واقف ہیں بہت ہی مختلف ہے۔ اِسیطرح اِسکاچستان کے پہاڑی علاقوں میں جو زبان بولی جاتی ہے وہ گیالک ہے اور یہ بھی انگریزی سے مختلف ہے۔ اِسکاچستان کے نشیبی علاقوں میں جو بولی بولی جاتی ہے وہ تلفظ اور بعض الفاظ و محاورات کی حد تک انگریزی سے

مختلف ہے۔ اِس کے باوجود ہم کہہ سکتے ہیں کہ اہل برطانیہ میں قومیت کی جو روح ساری ہے وہ اُن تمام علاقوں میں بشمول شمالی آئرستان ایک ہی ہے۔

قومی زندگی اور سیرت کا یہ میل ہندوستانی زندگی کے مقابلہ میں (جو متعدد متبائن اور بعض صورتوں میں متنازع فیہ طریقۂ خیال، طرز و روش اور کردار میں منقسم ہے) بہت نمایاں ہے۔ ہندوستان میں بہت سی قومیں اور ذاتیں ہیں اور یہ عموماً ایک ہی صوبہ یا ضلع میں یا ایک ہی قصبہ یا موضع میں ایک ہی جگہ آباد ہیں۔ اِن میں سے ایک کی زبان دوسرے کی زبان سے مختلف ہے۔ اِن کی روایات اور زاویہ ہائے نگاہ مختلف ہیں۔ انگلستان میں حالانکہ مختلف فرقوں یا کلیساؤں کی نسبت سے مختلف مذاہب کا وجود ہے لیکن اِس کے باوجود کردار و روش کا عام طور پر ایک ہی معیار ہے جس سے لوگ کافی حد تک قومی زندگی میں وحدت کا رنگ پیدا کر لیتے ہیں۔ یہ اتحاد گو ظاہری ہی لیکن پھر بھی اس ظاہری وحدت سے لوگوں کو ایک رشتہ میں منسلک کرنے اور دوسرے لوگوں یا اقوام سے ممیز ہونے میں مدد ملتی ہے۔

سرمایہ اور محنت یہ کہا جا سکتا ہے کہ سرمایہ اور محنت میں معاشی خلیج دن بدن وسیع ہوتی جا رہی ہے جو دولت مند اشخاص اور عامۃ الناس میں حقیقی فرق کے مترادف ہے۔ یہ بات صحیح ہے لیکن اِس فرق کے اثرات کو مبالغہ کے ساتھ نہیں بیان کرنا چاہیئے۔ کیونکہ وہاں سرمایہ منظم ہے اور محنت بھی منظم ہے اور حکومت کے توسط سے ان دونوں میں ربط و اتصال اور آپس کے تصفیوں کے لئے راستے مقرر ہیں۔ علاوہ ازیں مُلک کی معاشی زندگی میں

دونوں جماعتوں کو ایک دوسرے سے اِتصال قائم کرنے کے متعدد مواقع حاصل ہیں لیکن اس کے باوجود لوگوں کی معاملہ فہمی کیوجہ سے اِن دونوں میں کوئی ایسا تفرقہ نہ پڑسکا جس سے قومی زندگی میں اِنتشار پیدا ہو جاتا۔ ساتھ ہی قوم کے ایک طبقہ کے معاشی مطالبات کو دوسرے سے تسلیم کرانے میں تجارتی انجمنوں، قومی کونسلوں اور اس قسم کے دیگر ادارات سے بڑی مدد ملتی ہے۔ یہ صورت حال اس خلیج سے بہت مختلف ہے جو ہندوستان میں مثال کے طور پر وہابی جماعت کے مسلمانوں کو دوسرے فرقوں کے مسلمانوں سے یا ہندوؤں یا جینیوں سے علیحدہ کرتی ہے یا جو خلیج ہمارے دولتمند لوگوں اور کاشتکاروں کے درمیان حائل ہے۔

ذات پات یہ کہا گیا ہے کہ ہندوستان میں ذات پات کا جو طریقہ رائج ہے وہ ہندوستان کے لئے مخصوص نہیں ہے اور یہ کہ اِنگلستان میں اُونچے طبقات اور کام کرنے والے طبقات میں حقیقی معنوں میں ذات پات کے خیالات پائے جاتے ہیں۔ میں نہیں سمجھتا ہوں کہ یہ بیان اِتنا واضح ہے جتنا کہ اِس قسم کے ایک عام اور وسیع بیان کو ہونا چاہیئے۔ یہ سچ ہے کہ ایک زمانہ میں جاگیرداروں اور عام لوگوں میں ایک دوسرے سے الگ تھلگ رہنے کا خیال ضرور موجود تھا۔ لیکن اِس خیال کا کبھی صریح طور پر اظہار نہیں ہوا اور ان دونوں میں ہمیشہ میل جول ہوتا رہا۔ اکثر غریب لوگ مالدار بن گئے اور اُنھوں نے جائدادیں خریدیں گو ابتدا میں جاگیرداروں کے خاندانوں کے نزدیک اُن کی خاندانی وجاہت مشتبہ ہی رہی لیکن ایک دو پشت گذرنے کے بعد حالات بدل گئے اور دونوں میں کوئی خاص فرق باقی نہیں رہا۔ اِسیطرح اِنگلستان کے موروثی امرا

بھی اکثر و بیشتر معمولی خاندانوں سے منتخب کئے گئے ہیں اور یہ کہا جا سکتا ہے کہ فی زمانہ دارالامراء کے اکثر اراکین کا تعلق ایسے خاندانوں سے ہے جنہوں نے حال حال میں یا گذشتہ دو تین صدیوں میں ترقی کی ہے۔

جامعاتی طبقہ برطانیہ عظمیٰ میں جامعاتی تعلیم والوں کا کوئی گروہ یا طبقہ نہیں ہے لیکن اُنیسویں صدی کے وسط یا شاید اُس سے کچھ بعد تک پبلک اسکول کے تعلیم یافتہ لوگوں کا ایک سماجی طبقہ تھا جس کو ملک میں تھوڑی بہت اہمیت حاصل تھی۔ برطانوی تعلیم میں اِس طبقہ کا قبضہ جاری رہا۔ لیکن حال حال میں قدیم ترین پبلک اِسکولوں کو بھی جدید تعلیم کی اِسکیم میں شریک کیا گیا ہے اور طبقہ واری اِمتیازات بتدریج زائل ہوتے جا رہے ہیں۔ اکثر جدید پبلک اِسکول حالیہ پیداوار ہیں اور اُن کی حیثیت، اِیٹن، ہیرو یا ونچسٹر جیسے اِسکولوں سے بالکل مختلف ہے۔ اِسیطرح اکسفورڈ اور کیمبرج کی دونوں قدیم جامعات جو اُونچے طبقات کے لئے مخصوص سمجھی جاتی ہیں اب برطانوی تعلیم کی عام اِسکیم کے تحت ہیں۔ ان جامعات میں اب عوام کے اکثر لڑکے تعلیمی وظائف اور اِمداد کے ذریعہ شریک کئے جاتے ہیں۔ اِن میں سے بعض تو دیہات کے معمولی بورڈ اِسکولوں سے بھی آتے ہیں۔ اکسفورڈ میں تو ایک ایسا کالج ہے رسکن کالج۔ جو خاص طور پر مزدور پیشہ طبقات کی تعلیم کے لئے مخصوص ہے۔ اِس قسم کی اور بہت سی جدید جامعات ہیں جو جدید خیالات کی حامی ہیں اور جہاں ادنیٰ متوسط اور مزدور پیشہ طبقات کے مرد اور عورتوں کی بڑی تعداد شریک ہے۔

سیاسی جماعتیں یہ کہا جا سکتا ہے کہ سیاسی جماعتیں خاص گروہوں میں منقسم ہیں

جو سماجی زندگی میں رخنے ڈالتے ہیں۔ ایسا شاید ایک صدی قبل ممکن تھا لیکن آجکل نہیں ہے قدیم ٹوری اور وِگ جماعتیں ناپید ہوگئی ہیں البتہ کبھی کبھار اُن کے نام سُنے جاتے ہیں۔ جدید جماعتیں خود کشمکش کی حالت میں ہیں۔ ہر عام اِنتخاب کے وقت ہمیشہ ایک دو جماعتوں میں الٹ پھیر ہوتی ہے اور نئی جماعتیں معرض وجود میں آتی رہتی ہیں۔ ایسی کوئی جماعت نہیں جسے قائم کہا جا سکے یا ایسی جو ایک ہی تعداد یا طبقہ اشخاص کے لئے مخصوص ہو۔ ایوانات قانونی میں کتنی بھی جماعتیں ہوں لیکن یہ امر خوش آئند ہے کہ خارجی پالسی یا ایسے معاملات جن میں ملکی مفاد بحیثیت مجموعی کسی دوسرے ملک کے مفاد کے مغائر ہو تو عام طور پر آپس میں سمجھوتہ کر لیا جاتا ہے جس کے بعد تمام جماعتیں حکومت کی تائید کرتی ہیں جو فی الوقت قوم کی نمائندہ سمجھی جاتی ہے۔ اِسیطرح پارلیمنٹ میں بھی خاص روایات ہیں جو حکومتِ وقت اور حزب الاختلاف کے تعلقات کو معین کرتے ہیں۔ ہر حزب الاختلاف اِس امر سے واقف ہے کہ کسی دن اسے بھی حکومتی ذمہ داریوں اور عہدوں سے دوچار ہونا پڑیگا لہٰذا داخلی سیاسیات کے اِختلافی امور میں کتنی بھی سخت مخالفت کیوں نہ ہو لیکن وہاں آپس میں ملکر کام کرنے کا جذبہ ضرور پایا جاتا ہے۔

پبلک زندگی

بحیثیت مجموعی اِنگلستان کی پبلک زندگی کی پاکیزگی سے میں بہت متاثر ہوں۔ کبھی کبھار رشوت ستانی کے قصے بھی سُنے جاتے ہیں جو عموماً قصبہ کی کونسلوں یا معمولی اِنتظامی ادارات میں پیدا ہوتے ہیں۔ لیکن اِنگلستان کی ستائش میں میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ وہاں پبلک زندگی

عام رجحان اکثر ممالک کے بہ نسبت جن سے میں واقف ہوں پاکیزگی کی طرف بہت زیادہ مائل ہے۔ ہر شخص جانتا ہے کہ مسٹر بالڈون ایک بے داغ کردار کے مالک مشہور رہیں جو نہ صرف ذاتی و خانگی اغراض و مفاد سے بالاتر ہیں بلکہ جماعتی اغراض و مفاد سے بھی یا اُن شاطرانہ اغراض و مفاد سے جو ادنیٰ ذہنیت کے سیاست دانوں میں پائے جاتے ہیں۔ لیکن اُن کے جیسے وہاں بیسوں آدمی ہیں۔ اِس سلسلہ میں یہ واقعہ قابل ذکر ہے کہ ایک مستقل و اعلیٰ ترین عہدہ دار نے ایک کمپنی سے کچھ ایسی مفاہمت کرلی تھی کہ ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد کمپنی میں اُسے بڑی خدمت مل جائے۔ لیکن جب مسٹر بالڈون کو اس کا علم ہوا تو بڑی حکمت اور تدبیر سے اُنھوں نے اس ملازم سرکار کے کردار کی مذمت کی اور اس عہدہ دار کو اپنی ملازمت سے دست بردار ہونا پڑا۔ اِس معاملہ میں رائے عامہ نے مسٹر بالڈون کی کامل تائید کی۔ اِسیطرح جنگ عظیم کے وقت مسٹر آسٹن چمبرلین آنجہانی نے اپنی وزارت ہند کے زمانہ میں جنگ کی بعض بدانتظامیوں کی ذمہ داری اپنے سر لے لی حالانکہ ذاتی طور پر وہ کیسطرح ذمہ دار نہیں قرار دیئے جاسکتے تھے۔ اُنھوں نے محسوس کیا کہ اگر کوئی خرابی پیدا ہوئی ہے تو بہ حیثیت افسر اعلیٰ اُس کی ذمہ داری اور نتائج اُنھیں قبول کرنے ہونگے۔ لہذا وہ مستعفی ہو گئے۔ چونکہ اس معاملہ میں وہ بالکل بے قصور تھے لہذا اس استعفاء سے اُن کی آئندہ زندگی پر کوئی اثر نہیں پڑا بلکہ اُس سے پبلک زندگی کے اِس اُصول کی تائید ہوئی کہ ہر افسر اعلیٰ اُن نتائج کا ذمہ دار رہیگا جو اُس کے دور انتظام میں کسی خرابی کیوجہ سے پیدا ہوں۔ اس سے ظاہر ہے کہ اِنگلستان میں ملازمین سرکار کا معیار کردار کتنا

بلند ہے۔ مسٹر گلاڈسٹن کے زمانہ کا بھی ایک واقعہ ہے کہ کسی جماعت کے ایک لیڈر سے جو مسٹر گلاڈسٹن کی لبرل جماعت سے اشتراک عمل کئے ہوئی تھی کوئی اخلاقی جرم سرزد ہونے پر مسٹر گلاڈسٹن نے اس لیڈر کے مستعفی ہونے پر اصرار کیا تھا۔ شاہ ایڈورڈ کی دستبرداری کے حالیہ واقعہ کے وقت ایک ایسے معاملہ میں جس میں برطانوی اخلاقی معیارات کا امتحان تھا مسٹر بالڈون نے جس تدبر، بردباری اور ثابت قدمی کا ثبوت دیا اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ برطانوی قوم اپنی اعلیٰ ترین روایات کو برقرار رکھنے میں کس طرح بلا فرق مراتب متحد ہو سکتی ہے۔

رائے عامہ

یہ سب اس لئے ممکن ہے کہ وہاں ایک مضبوط اور بیدار رائے عامہ موجود ہے۔ اس کا یقیناً امکان ہے کہ ایسی چیزوں میں رائے عامہ سے غلطی ہو جائے جن میں کسی شخص کا ذاتی کردار عامۃ الناس کے خیالات کے مغائر ہو۔ لیکن میرے خیال میں برطانوی رائے عامہ کی اصابت نے اکثر نازک موقعوں پر برطانیہ عظمیٰ کی دستگیری کی اور اسے خطرات سے بچایا ہے۔

رائے عامہ کی اس طاقت کی وجہ سے برطانوی اخبارات بھی سیدھے رہتے ہیں۔ میں یہ نہیں کہتا کہ وہ کبھی ذوقِ سلیم کو دھکا نہیں پہنچاتے لیکن میں یہ ضرور کہونگا کہ تمام اچھے اخبارات تنقید عامہ کے اعلیٰ ترین معیارات کو پیش نظر رکھتے ہیں اور اپنے آپ کو کبھی اتنا نہیں گرا لیتے کہ ذاتیات کے رکیک حربوں کے اختیار کرنے یا ایسے طریقوں پر عمل پیرا ہونے کا الزام اُن پر عائد کیا جا سکے جو مفاد عامہ کے لئے مضرت رساں ہوں۔

گھریلو زندگی

مشرق میں عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ ہندوستانی گھریلو زندگی کے مقابلہ میں برطانوی زندگی کچھ اچھی نہیں اگر اُس کے یہ معنی ہیں کہ ہندوستان کی طرح خاندان آپس میں ایک دوسرے سے مل کر نہیں رہتے ہیں تو یہ صحیح ہے۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ خاندان کی برطانوی تعریف جو شوہر، بیوی اور کمسن بچوں پر مشتمل ہے، اچھی تعریف ہے۔ اِس سے ہر فرد کو اپنی انفرادیت کے نشوونما دینے کا موقع ملتا ہے۔ جوان لڑکے اور لڑکیاں شادی کے بعد اپنا جینا الگ کر لیتے ہیں۔ اِس کے یہ معنی نہیں کہ وہ اپنے والدین یا قریبی رشتہ داروں سے بالکل بے تعلق ہو جاتے ہیں۔ بلکہ اُس کے یہ معنی ہیں کہ اُنہیں اپنے اِنفرادی ذوق و دلچسپی کو اپنے طور پر ترقی دینے کا بہت اچھا موقع ملتا ہے۔ اکثر خاندانوں کے جوان سال لڑکے اور لڑکیاں آسٹریلیا، جنوبی افریقہ، کینیڈا، اور برطانوی شہنشاہیت کے دیگر علاقوں میں بس گئے ہیں۔ کچھ دنوں کے لئے ممکن ہے یہ لوگ بے تعلق سے ہو جائیں لیکن بعد میں خود اُن کی آزاد زندگی اُنھیں اپنے خاندان اور عزیزوں کی محبت بھری یاد تازہ رکھنے اور نسلاً بعد نسلٍ اِس تعلق کو برقرار رکھنے میں معاون ثابت ہوتی ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ بات کبھی پیدا نہ ہوتی اگر تمام لوگ ایک ہی جگہ گتھے رہتے اور ہر بزرگ خاندان کی تبدیلی کے وقت خاندانی معاملات میں جھگڑے اور فساد کی صورتیں رُونما ہوتی رہتیں۔ اِنگلستان اور ہندوستان کے صنفی معیار بھی ایک دوسرے سے مختلف

ہیں۔ لیکن میں اپنے تجربہ کی بناء پر یہ کہہ سکتا ہوں کہ میں نے انگلستان کے معیار اخلاق کو ہندوستان کے مقابلہ میں کسی طرح گرا ہوا نہیں پایا۔ بلکہ میں سمجھتا ہوں حقیقت حال اس کے برعکس ہے۔

رائے سری کشن

رائے سری کشن بیرسٹر حیدرآباد کے ایک مسلمہ سیاسی لیڈر، ملک و مالک کے سچے بہی خواہ اور ہمدرد اور اپنی بے لوث زندگی اور خلوص کی وجہ سے ملک میں بے حد مشہور و ہردلعزیز ہیں۔ ہریجنوں کی فلاح و بہبود اور اُن کی ترقی کے لئے آپ ایک زمانہ سے کوشاں ہیں اور اِس خصوص میں آپ کی خدمات ملک میں اِنتہائی قدر کی نگاہوں سے دیکھی جاتی ہیں۔ آپ کا شمار حیدرآباد کے چوٹی کے بیرسٹروں میں ہے۔

آپ کا قیام اِنگلستان میں ۱۹۰۶ء تا ۱۹۱۰ء رہا۔ ۱۹۲۱ء میں بھی سیاحت کی غرض سے آپ یورپ تشریف لے گئے تھے۔

یورپ کی مادی ترقی میرے اِس سوال پر کہ اہل یورپ کی زندگی میں کونسی چیزیں جاذب نظر اور اُن کی ترقی کا باعث ہیں رائے سری کشن بیرسٹر نے فرمایا کہ یورپ کی سب سے نمایاں خصوصیت اُس کی

مادی ترقی ہے جس کا انحصار اہل یورپ کی محنت اور حوصلہ مندی پر ہے محنت میں وہ تمام خصوصیات داخل ہیں جن پر لفظ کاہلی کا اطلاق نہیں ہوتا۔ عمل دراصل اُنکی زندگی کا اصل اُصول ہے۔ حوصلہ مندی سے مراد کسی کام کو جوش اور یقین کے ساتھ کرنا ہے خواہ اس میں دوسرے کتنی ہی نکتہ چینی کریں۔ حقیقت یہ ہے کہ دنیا میں قوموں کی ترقی ان ہی دو چیزوں کی بدولت ہے اور ان کے نہونے سے قومیں ترقی سے محروم بھی ہوجاتی ہیں۔

قابل تقلید خصوصیات

جب میں نے یہ دریافت کیا کہ ہمارے لئے یورپ کی کونسی چیزیں قابل تقلید ہیں آپ نے فرمایا کہ ہمیں کسی قسم کی تقلید کی ضرورت نہیں۔ ہمارے مذہب، ہماری تہذیب اور ہمارے تمدن میں ترقی کے سارے امکانات موجود ہیں۔ مشرقی اقوام کی ترقی دیگر اقوام کے لئے ہمیشہ سرمایۂ بصیرت رہی ہے۔ کسی قوم یا تمدن کی تقلید کرنے میں بڑی قباحتیں ہیں۔ ایک معمولی مثال سے اس کی یوں توضیح ہوسکتی ہے۔ ہندو گھرانوں میں چوکھوں میں کھانے کا رواج ہے۔ روزانہ کھانے کے مقام کی صفائی ہوتی ہے، ہر شخص صبح اشنان کرتا ہے اور ایک خاص طریقہ پر کھانا کھایا جاتا ہے۔ لیکن اگر اس کو چھوڑ کر میز کرسی پر کانٹے چھری سے کھانے کا طریقہ اختیار کیا جائے تو پرانے رسوم اور دستور کی اہمیت اور عظمت دلوں میں باقی نہیں رہ سکتی اور اُن کا چھوڑنا ضروری ہے۔ اس کھانے ہی کی مثال کو اور واضح کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ قدیم طریقہ کتنا سہل سستا اور آرام دہ تھا۔ مغربی طرز کے کھانوں کا اہتمام ہی جداگانہ ہوتا ہے۔

میز کرسی ہے، کانٹا چھری ہے، سامان خورد نوش ہے، پکوان ہے، بٹلر ہے، کمرہ ہے، کھانے کا طرز ہے، غرض بیسیوں نئی چیزیں ہیں۔

تیس چالیس سال قبل حیدرآباد میں صرف دو چار ہی لوگ مغربی تہذیب کے دلدادہ تھے۔ اُس زمانہ کا ایک مغربی طرز کا ڈنر خصوصیت سے قابل ذکر ہے جس میں حیدرآباد کے تقریباً تمام سربرآوردہ لوگ شریک تھے جن میں سے اکثر کانٹے چھری کے اِستعمال ہی سے ناواقف تھے۔ میز پر ہر شخص اپنے برابر والے کی نقالی کر رہا تھا۔ اِتفاق سے ایک صاحب گھبراہٹ میں کسی چیز کو کانٹے سے کھانے کے بجائے چھری سے کھا گئے اور ان کے ہونٹوں پر چھری کا چرکا لگ گیا اور خون نکلنے لگا۔ ایک ہنسی ہوگئی۔ غرض دوسروں کی تقلید کرنے میں نہ صرف اپنی بہت سی چیزوں کو چھوڑنا پڑتا ہے بلکہ تقلید بھی اُدھوری رہ جاتی ہے۔ ہر قوم کے رسوم اس قوم کے تمدن، معیار زندگی اور روایات کی مناسبت سے ہوا کرتے ہیں جن کو چھوڑنے کے یہ معنی ہیں کہ قومی وقار اور روایات کو صدمہ پہنچایا جائے۔

تقلید کی توضیح ایک اور مثال سے ہوسکتی ہے۔ آجکل ہمارے پاس یورپ کی اِتباع میں اہم تقاریب میں کالے کپڑے پہننے کا رواج ہے۔ درباری لباس، عدالتی لباس، ڈنر یا دعوتوں کا لباس، مدارس اور کالجوں میں طلبا و طالبات کا لباس کالا ہے۔ اِس سیاہ پُوشی کی غایت معلوم کرنے کے قبل ہمیں یہ دیکھنا چاہیئے کہ انگلستان میں آخر اِس کا رواج کیوں ہوا؟ یہ ایک مسلّمہ بات ہے کہ ہر قوم کے لباس پر اِس ملک کے تمدن، رسم و رواج اور آب و ہوا کا اثر

پڑتا ہے۔ انگلستان ایک سرد ملک ہے، وہاں فضا ہمیشہ کہر آلود اور گرنیوں کے دھوئیں سے ہوا مکدر رہتی ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسے ملک میں سفید کپڑے جلد میلے ہو جاتے ہیں اس طرح وہاں سیاہ کپڑوں کا پہننا فیشن نہیں ضرورت ہے۔ پھر ہندوستان میں اسکی کیا ضرورت ہو سکتی ہے۔ اس کا جواب آسان ہے۔ یہ حاکم قوم کی ایسی تقلید ہے جس میں خود حاکم قوم کا فائدہ ہے۔ کیونکہ انگلستان کے کارخانوں کی رونق اسی میں ہے۔ اب ہم اس تقلید کے دوسرے پہلو پر نظر ڈال کر دیکھینگے کہ اس میں ہمارا کیا نقصان ہے۔ سب سے پہلے یہ کہ ہمارا قدیم درباری، عدالتی یا تقاریب کا لباس ختم ہو گیا۔ جس کے یہ معنی ہیں کہ اس کے ساتھ اور بہت سی چیزوں کا خاتمہ ہو گیا۔ جس طرح ہندوستان کی وجہ سے آج یورپ کی گرنیوں کی رونق ہے اسیطرح کسی زمانہ میں ہمارے جلاہوں کے گھروں میں اُجالا تھا۔ اُن کا روزگار جاتا رہا۔ وہ یورپ کے جیسا کپڑا بنا نہیں سکتے اور ہم باہر سے خریدنے پر مجبور ہیں۔ اگر ملک میں یہ کپڑا تیار بھی ہونے لگے تو ہم باہر کے کپڑے سے مسابقت نہیں کر سکتے۔ وہاں کے کارخانے صدیوں سے قائم ہیں اُن کا معیار کارکردگی بڑھا ہوا ہے اور اُن کا تجربہ وسیع ہے۔ غرض اُن کا مقابلہ ہر لحاظ سے ہمارے لئے مشکل ہے اور معاشی و معاشرتی ہر حیثیت سے ہم خسارہ میں رہے۔

آزادیٔ نسواں آزادیٔ نسواں کے متعلق رائے سری کشن بیرسٹر کے خاص خیالات ہیں۔ آپ ہندوستان میں آزادیٔ نسواں کی تحریک کے جو یورپ کی اتباع میں ہو، حامی نہیں ہیں۔ کیونکہ ہمارا ماحول، حالات اور روایات مختلف ہیں اور یورپ کے تمدنی سماجی اور معاشی تصورات ہم سے بالکل جداگانہ ہیں

یورپ کی عورتوں کی موجودہ سیاسی، سماجی اور معاشی حیثیت نتیجہ ہے صدیوں کے ارتقاء کا۔ وہاں پر یہ تحریک دراصل معاشی کشمکش کی پیداوار ہے۔ انگلستان میں بلحاظ آبادی مردوں اور عورتوں کا تناسب ۱:۴ ہے۔ اور قانوناً صرف ایک عورت سے شادی کی جاسکتی ہے گویا تین عورتیں بے سہارا رہ گئیں جن کے لئے بجز کسب معیشت کے کوئی چارہ نہیں اور سوسائٹی میں اپنی عزت اور وقار قائم رکھنے کے لیئے انہیں اپنے پیروں پر کھڑا رہنا ضروری ہے۔ اس طرح جب مرد اور عورت میں معاشی یکسانیت پیدا ہو جائے تو حقوق کا سوال پیدا ہونا ایک فطری امر ہے۔ عورتوں کو حق رائے دہی حاصل ہونے کی بڑی وجہ یہی ہے اور یہ اس مشہور سیاسی ضرب المثل کے مطابق بھی ہے کہ بغیر نمائندگی محصول عائد نہیں کیا جاسکتا۔ لیکن ہندوستان میں نہ عورتیں معاشی حیثیت سے مرد کے برابر ہیں اور نہ اُن کو رائے کی ضرورت ہے۔ محض اس لئے کہ انگلستان کی عورتوں کو حق رائے حاصل ہے ان کو بھی ہونا چاہیئے ایک خام خیالی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ہماری عورتوں کو ترقی کی بڑی ضرورت ہے۔ لیکن یہ ترقی ہمارے اپنے ماحول، ہمارے اپنے حالات، روایات اور خصوصیات قومی کے تابع ہوگی۔ ہماری عورتوں کو یورپ کی عورتوں کے نقش قدم پر چلنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ ایک مثال سے اس کی یوں توضیح ہو سکتی ہے۔

انسانی زندگی کے دو پہلو ہیں جو ساتھ ساتھ چلتے ہیں اور یہ ایک دوسرے کیلئے لازم و ملزوم ہیں۔ تکلیف اور راحت، نشیب و فراز، تاریکی اور روشنی اور انسان کے پیش نظر ہمیشہ تاریک پہلو رہتا ہے کیونکہ اس میں اس کی آزمائش ہے۔ ہماری سوسائٹی میں عملی تربیت کے سلسلہ میں جس چیز پر سب سے زیادہ زور دیا جاتا ہے

وہ یہ ہے کہ انسان تکلیف میں ثابت قدم رہے۔ والدین اولاد کو، اُستاد شاگرد کو اور پیشوایان قوم اپنی قوم کو اسی کی تلقین کرتے ہیں اور یہ چیز ہماری تربیت کا ایک اصل اصول بن گئی ہے۔ اس معاملہ میں ہماری عورتیں مردوں سے زیادہ صبر و استقلال، تحمل و بردباری اور تکلیف سہنے میں بڑھی ہوئی ہیں۔ عورت کے متعلق ہمارا یہ تصور ہے کہ وہ تکلیف کے لئے بنائی گئی ہے اور جب بچپن ہی سے یہ چیز اُس کے ذہن نشین کرائی جائے تو اس میں لازماً سادگی، کفایت شعاری اور سگھڑپن کی عادتیں پیدا ہونی چاہیں۔ اب عورت کی اس زندگی کو پیش نظر رکھکر ہم دیکھینگے کہ موجودہ زمانہ میں یہ خصوصیات کہاں تک برقرار رہتی ہیں۔ ہمارے مدارس کی طالبات دن بدن اسراف کی طرف مائل ہوتی جا رہی ہیں۔ پڑھائی سے زیادہ اُنہیں فیشن، آرائش، کپڑوں، ٹائلٹ اور جیب خرچ کا خیال ہے۔ آئے دن مدارس میں کچھ نہ کچھ تقاریب ہوتی رہتی ہیں اور لڑکیوں سے چندے وصول کئے جاتے ہیں۔ غریب سے غریب گھرانے کی لڑکی کو اپنا وقار قائم رکھنے کے لئے ان کھیل تماشوں میں شریک ہونا پڑتا ہے۔ اگر آئندہ زندگی میں اُنھیں ایک عیش پسند زندگی میسر نہ آئے جس کے وہ آئے دن خواب دیکھا کرتی ہیں تو پھر اُن کی گذر بسر کیسے ہو۔ کیا وہ چوری کریں یا فاحشہ پن۔ کیا وہ غیر محسوس طور پر تباہی کے تاریک گڑھوں کی طرف نہیں ڈھکیلی جا رہی ہیں۔ اگر ہماری لڑکیاں تکلیف کے لئے تیار کی جائیں اور عملی زندگی میں اُنھیں راحت سے سابقہ پڑے تو کیا یہ سونے پر سہاگہ نہیں ہے۔ دولت کی خیرگی سے وہ اندھی نہیں ہوسکتیں اور اپنی مصیبت زدہ بہنوں کا خیال اُن کے دل سے دُور نہیں ہوسکتا۔

اگر یورپ کی عورتوں کے نقش قدم پر چلکر آزادی حاصل کی جائے تو یہ آزادی کہاں رہی۔ آزادی تو ہر قسم کی قید و بند سے آزادی کا نام ہے۔ ایک اور خرابی ہماری سوسائٹی میں پیدا ہو رہی ہے۔ وہ یہ کہ مغربی تعلیم اور تمدنی اثرات کیوجہ سے ہمارے مردوں کی ذہنیتوں میں تبدیلی پیدا ہوگئی ہے۔ قدیم طرز کی مشرقی عورتیں اب اُنکے معیار پر پوری نہیں اترتی ہیں اور مرد اُن کو کسیطرح اپنے معیار پر لانا چاہتے ہیں یہ آئے دن کا مظاہرہ ہے کہ کس طرح ہماری عورتیں باوجود مغربی تعلیم اور تمدنی اثرات سے براہ راست کوئی تعلق نہ رکھنے کے غیر محسوس طور پر مغربی اثرات کو قبول کرتی جا رہی ہیں۔ جس کی ذمہ داری بڑی حد تک مردوں پر عائد ہوتی ہے۔

ہماری سوسائٹی میں بہت سی ایسی مثالیں ملینگی کہ شادی کے بعد عورتوں نے مردوں کے اصرار پر پردے کو خیرباد کہدیا۔ اور باہر نکلنے کے بعد وہ فیشن کی دلدادہ بن گئیں۔ کیونکہ اس کے بغیر وہ سوسائٹی میں گھل مل نہیں سکتیں۔ اُن کے اخراجات بڑھ گئے۔ اُن میں اسراف پیدا ہوگیا۔ اگر اس کے بعد مرد اپنی بیوی پر کچھ قیود اور پابندیاں عائد کرنا چاہے یا اُس کے اسراف کو روکنے کی کوشش کرے تو یہ ناممکن ہے۔ اس کی ایسی ہی مثال ہے جیسے ببول کا بیج بو کر آم کی توقع رکھنا۔ ہر عمل نیت کے ساتھ ہے۔ اَلاَعمَالُ بِالنِّیۃ۔ جو شخص جس نیت سے کام کریگا اُس کو ویسا ہی پھل ملیگا۔

تعدد ازدواج اُوپر بتلایا گیا ہے کہ یورپ میں قانوناً صرف ایک عورت سے شادی کی جاسکتی ہے اور بلحاظ آبادی مرد اور عورت کا تناسب ایک اور چار ہے۔ جب چار میں سے تین عورتوں کا بیاہ نہو سکے تو لازماً

سوسائٹی میں جنسی بے راہ روی کا پیدا ہوجانا ایک فطری امر ہے اور اس کا سدباب اُس وقت تک مشکل ہے جبتک کہ وحدتِ ازدواج کے قانون میں ترمیم نہ کی جائے۔ اسلام میں چار بیویوں کی جو اجازت دیگئی ہے اُس کی یہی وجہ معلوم ہوتی ہے کہ اس قسم کی شدید صورتِ حال کا مقابلہ کیا جائے۔ ہر قوم اور ملک کے تصورات اس ملک کے حالات کے مطابق ہوا کرتے ہیں اور مصلحانِ قوم یا حکومت اُن ہی حالات کو پیش نظر رکھکر آئین و اُصول مدون کرتی ہے۔ ایام جاہلیت میں عرب میں عورت کی کوئی قانونی حیثیت نہیں تھی اور وہ خرید و فروخت کی چیز تھی۔ حضرت محمد صلعم نے انھیں ایک حیثیت عطا کی۔ مردوں کو جنکی بیویوں کی تعداد غیر معین ہوا کرتی تھی ایک بیوی سے شادی کرنے کے لئے کہا گیا اور خاص حالات میں چار بیویوں تک کی اجازت دیگئی کیونکہ عربوں کے حالات کا لحاظ کرتے ہوئے وہاں اس امر کی ضرورت تھی کہ اُنھیں ایک بیوی سے پابند کردیا جاتا۔ لیکن جس ملک کے حالات ایسے نہوں وہاں اِس قسم کے قانون کے نفاذ کی ضرورت بھی نہیں ہے۔ انگلستان میں ایسے قانون کی ضرورت ہے مگر وہاں تعدد ازدواج کی ممانعت ہے اور عملاً سوسائٹی میں یہ چیز موجود ہے۔

مشرقی عورت

ہندوستان میں عورت اور مرد میں کسی قسم کی معاشی کشمکش کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ دہرم شاستر کی رو سے شوہر و زوجہ ایک رُوحانی و ابدی رشتہ میں منسلک ہوتے ہیں۔ شادی ایک مذہبی سنسکار ہے۔ ایسی صورت میں ظاہر ہے کہ شوہر کو اپنی زوجہ کی تمام ضرورتوں اور آسائشوں کا خیال رکھنا پڑتا ہے۔ بحیثیت استری وہ گھر کی مالکہ ہے۔ گھر کا سارا کاروبار اور

اور سارا اِنتظام اُس کے تفویض ہے۔ اُس کا سوامی اُس کی جملہ ضرورتوں کو پورا کرتا ہے اُس کے حقوق و فرائض متعین ہیں۔ اِسلام میں بھی ایسا ہی ہے۔ عورتوں کو وراثت میں حق حاصل ہے۔ وہ جائداد کی مالک بن سکتی ہے اور اپنے کاروبار کو بلا شرکت غیرے انجام دے سکتی ہے۔ یہ اور بات ہے کہ ان تمام چیزوں کے ہوتے ہوئے ہماری عورتوں کے بہت سے حقوق مرد کے ہاتھوں پامال ہوتے ہیں اُن کی حق تلفیاں ہوتی ہیں لیکن وہ خاموش رہتی ہیں۔ یورپ کی حالت اُسکے بالکل برعکس ہے۔ وہاں عورتوں کو اِس قسم کے حقوق حاصل نہیں تھے۔ اُنکے ساتھ سخت ظلم اور ناانصافیاں روا رکھی گئی تھیں۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تعلیم کی وسعت کے ساتھ ساتھ عورتیں حقوق کا مطالبہ کرنے لگیں۔ اُن کی ناگفتہ بہ حالت دیکھکر اکثر مردوں کو بھی اُن سے ہمدردی پیدا ہوگئی۔ جوں ہی ملک میں موافق ماحول پیدا ہوا عورتیں آزاد ہوگئیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ ہماری عورتوں کو پہلے ہی سے حقوق حاصل تھے اور وہاں ایسے حقوق حاصل نہیں تھے لہذا اُن کے حصول کی کوشش کی گئی۔

تعلیمی معاملات

تعلیمی معاملات میں رائے سری کشن بیرسٹر کا خیال ہے کہ دُنیا کے ہر ملک میں تعلیم کے بنیادی اُصول تقریباً ایک ہی ہیں جنہیں ہر قوم اپنے حالات، ماحول اور قومی ضروریات کے تحت اِضافہ و ترمیم کرلیتی ہے۔ بدقسمتی سے ہمارے ملک میں جو تعلیمی طریقہ رائج ہے وہ ٹھیٹ انگریزی کی اِتباع میں ہے جس سے ہماری قومی ضروریات پُوری نہیں ہوتیں۔ انگریزی تعلیم یا مغربی اَدب سے اِستفادہ کرنے والے مارکزم، کمیونزم، بالشویزم اور اِس قسم کے دیگر

"ایزم" کی طرف مائل ہوتے ہیں۔ اگر ہندوستانی دماغ اِس قسم کی تحریکات کی آماجگاہ بنیں جو یورپ میں بعض خاص حالات اور واقعات کے تحت پیدا ہوئی ہیں، تو ہندوستان کو اُن سے کس قسم کا فائدہ پہنچتا ہے؟ کیا ہندوستان میں ان تحریکات کو بھی کامیاب ثابت ہونا چاہیئے؟ اور کیا ہمارے مختلف فیہ مسائل کا یہ صحیح حل ہو سکتی ہیں؟ اگر نہیں ہو سکتی ہیں تو پھر اُن کے پیچھے وقت ضایع کرنے کے کیا معنی ہیں؟ اِسیطرح شکسپیر، ملٹن، شیلی اور بائرن کی شاعری سے ہندوستانی طالبعلم کو کیوں دلچسپی ہونے لگی جب خود ہندوستان نے ایسے بلند پایہ شاعر اور فلسفی پیدا کئے جن پر ہم رہتی دنیا تک فخر کر سکتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ مغربی تعلیم اور مغرب کی ہر چیز کی بنیاد اس خیال پر رکھی گئی ہے کہ مشرق کی ہر چیز بیکار محض ہے۔ مثال کے طور پر آپ مغربی طب ہی کو لیجیے جس کے سامنے ساری دُنیا کی طب فرسودہ ہو گئی ہی اور ہر ڈاکٹر اپنا یہ خوشگوار فرض سمجھتا ہے کہ وہ مشرقی طب کا جی کھول کر مضحکہ اُڑائے کیونکہ جتبک یونانی، ایورویدک علاج کی مذمت نہ کی جائے اُس کو روٹی نہیں مل سکتی۔

پیام نوجوانان ملک کے لئے رائے سری کشن بیرسٹر نے یہ پیام دیا ہے کہ وہ مغرب کی تقلید کرنا چھوڑ دیں تقلید صرف اُن لوگوں کے لئے سزاوار ہے جو تہذیب و تمدن میں تہی داماں ہوں۔ ہم لوگوں کو اُس کی ضرورت نہیں ہے۔ ہمارے لئے تقلید نہ صرف مضر ہے بلکہ خود کشی کے مترادف ہے۔

ڈاکٹر لطیف سعید

ڈاکٹر محمد عبداللطیف سعید ایم۔ بی۔ سی ایچ (اڈنبرا) ملک کے ایک سچے بہی خواہ اور قومی لیڈر رہیں۔ ابتداءً آپ سررشتہ طبابت سرکارِ عالی میں سیول سرجن تھے لیکن ۱۹۲۰ء میں اپنی خدمت سے مستعفی ہو کر آپ نے خانگی پریکٹس شروع کی اور آج آپ ملک کے ایک مشہور و مسلمہ ڈاکٹر ہیں۔

آپ کا قیام انگلستان میں ۱۹۰۸ء تا ۱۹۱۵ء رہا۔

انگریزوں کے خصوصیات

انگریزوں کی زندگی اور معاشرت میں سب سے زیادہ قابلِ قدر اُن کی راستبازی، فرض شناسی اور خانگی اور پبلک زندگی میں ضبط و نظم کا پایا جانا ہے۔ ایک انگریز کا گھر خوشی کا مسکن ہوتا ہے اور اس کو بجا طور پر خانگی زندگی کا نمونہ کہا جا سکتا ہے۔

یورپین سوسائٹی کی اخلاقی کمزوریوں کے متعلق مشرق میں جو روایات مشہور ہیں وہ بالکل غیر صحیح ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ صنفی معاملات میں یورپ (اور انگلستان)

کا اخلاقی معیار کسیطرح دوسرے ممالک سے پست نہیں ہے۔ تعجب تو یہ ہے کہ باوجود ہر قسم کی آزادی کے وہاں پر" بد اخلاقی بہت کم ہے۔

مغرب کے متعلق ہمارا دوسرا خیال یہ ہے کہ وہ مادّہ پرست ہے اور روحانیت سے اُسے کوئی تعلق نہیں۔ یہ بھی صحیح نہیں ہے۔ کیونکہ روحانی زندگی کے متعلق اہل یورپ کا نقطہ نظر ہم سے جداگانہ ہے۔ معاشری خدمت گذاری ایثار اور ہمدردی وہاں کی زندگی کے عام اُصول ہیں اور یہی وہ خصوصیات ہیں جن سے "سوسائٹی کی برائیاں" دُور ہوتی ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ وہاں مذہب کا اِتنا چرچا نہیں ہے اور لوگ اپنی مذہبیت کی نمائش بھی نہیں کرتے لیکن مذہب سے اِنسان میں جو خوبیاں پیدا ہوسکتی ہیں وہ اُن میں موجود ہیں۔

ہم میں سے اکثر لوگ جو یورپ جاتے ہیں وہ یورپین زندگی کی اصل روح کو محسوس نہیں کرتے۔ ہم محض صورت پر جاتے ہیں اور ہماری اِنتہا یہ ہوتی ہے کہ اہل یورپ کے ظاہری خط وخال کی نقالی کرلیں۔ اور اس کا بھی حق ہم پوری طرح اَدا نہیں کرتے۔

یورپ سے ہم ایک اچھا سبق سیکھ سکتے ہیں اور وہ متحدہ زندگی میں نظم اور باقاعدگی کا پیدا کرنا ہے تاکہ جلد از جلد زیادہ سے زیادہ تعداد کو زیادہ سے زیادہ فائدہ حاصل ہوسکے۔

مولوی سید حیدر رضا صاحب زیدی

مولوی سید حیدر رضا صاحب زیدی یم۔ اے (آکسن) بیرسٹرایٹ لا غالباً وہ پہلے ہندوستانی ہیں جو بالکل بے سروسامانی کے عالم میں انگلستان پہنچے اور محض اپنی قابلیت سے نہ صرف کھایا کمایا بلکہ اعلیٰ ترین تعلیم بھی حاصل کی۔ اور اس کے بعد انگلستان ہی میں متوطن ہوکر بیرسٹری شروع کردی۔ اپنے تیئیس سال کے طویل قیام میں آپ نے بہت غائر نظر سے یورپ کے حالات کا مطالعہ کیا ہے انگلستان سے مراجعت کے بعد آپ نے حیدرآباد میں پریکٹس شروع کی ہے۔

آپ کا قیام یورپ و انگلستان میں ۱۹۰۹ء تا ۱۹۳۲ء رہا۔

حب الوطنی یورپ کی ترقی اور عروج کا راز حب الوطنی میں مضمر ہے۔ اور یہ اندازہ کرنا مشکل ہے کہ اہل یورپ کو اپنے وطن سے کس درجہ محبت ہے۔ اس کی کوئی حد و انتہا نہیں۔ اہل یورپ اپنے مقابلہ میں دنیا کی

کسی قوم کو عزت کی نگاہوں سے نہیں دیکھتے چنانچہ انگریز عام طور پر امریکہ، کینیڈا اور آسٹریلیا کے باشندوں کو جو اُن کے سگے بھائیوں کے برابر ہیں، حقیر سمجھتے ہیں اور اُن کا مضحکہ اُڑاتے ہیں۔

جذبۂ خدمت گذاری مُلک اور قوم کی خدمت کرنے کا اہل یورپ میں جو ولولہ پایا جاتا ہے وہ ہمارے یہاں ناپید ہے۔ یہاں ایثار کی بہت کم مثالیں نظر سے گذرتی ہیں۔ اِنگلستان میں رشوت ستانی کا کہیں نام نہیں۔ معمولی جوان کوتوالی سے لیکر حکومت کے اعلیٰ ترین عہدہ دار کا یہی حال ہے۔

جذبۂ حق پسندی جذبۂ حق پسندی میں بھی اہل یورپ کو ہمارے مقابلہ میں ایک اِمتیازی خصوصیت حاصل ہے۔ وہاں ہر شخص اپنے اور دوسروں کے معاملات میں حق اور اِنصاف کا حامی رہتا ہے۔

جذبۂ مساوات اہلِ یورپ آپس میں بلا تفریق ایک دوسرے سے مساویانہ برتاؤ کرتے ہیں۔ وہاں بڑے بڑے رؤسا یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ وہ ادنیٰ طبقہ کے لوگوں سے کسیطرح برتر و بالا نہیں ہیں۔ لوگ خود غرض نہیں ہیں کسی ایجاد یا اِختراع کو چھپا کر نہیں رکھا جاتا بلکہ اُس کو عام کر دیا جاتا ہے تاکہ ملک اور قوم کو اُس سے فائدہ پہنچے۔

معیار زندگی اہل یورپ کی زندگی دن اور رات کے چوبیس گھنٹوں میں گھڑی کی طرح پابند اور باقاعدہ ہے اور لوگوں میں فوجی قسم کی ترتیب اور باقاعدگی دیکھکر حیرت ہوتی ہے۔ غرض اِنسان وہاں اپنے عمل میں

شین سے کم نہیں ہے۔ اہل یورپ کی ضروریات زندگی بہت بڑھی ہوئی ہیں۔ کھانے اور کپڑے پر بہت روپیہ صرف ہوتا ہے اور اس کی ضرورت بھی ہے۔ کیونکہ ان کے بغیر سرد ممالک میں صحت اور توانائی برقرار نہیں رہ سکتی۔ اس اعلیٰ اور بلند معیار زندگی کی وجہ سے وہاں لوگوں کی تنخواہیں بھی زیادہ ہیں۔ چنانچہ لندن کے معمولی پولس کے جوان کی تنخواہ چار پونڈ ہفتہ وار یا تقریباً دو سو پچاس روپیہ ماہانہ ہوتی ہے۔ وہاں ہر شخص روزآنہ عادتاً ورزش کرتا ہے۔ شام میں عام طور پر لوگ ورزش کی خاطر میلوں پیدل چلتے ہیں۔ اور ہفتہ اور اتوار کے دن تو جنگلوں اور پہاڑوں میں نکل جاتے ہیں۔

قانون کی پابندی

انگلستان میں قانون کا جتنا احترام کیا جاتا ہے اُتنا کسی دوسرے ملک میں نہیں کیا جاتا۔ قانون کی نظر میں امیر و غریب، حاکم و محکوم سب برابر ہیں کسی قسم کے اثر و سفارش کو دخل نہیں ہے۔ اس کی توضیح ذیل کے واقعات سے ہوسکتی ہے۔

لندن کے ایک خطاب یافتہ مددگار کوتوال جب برسوں کی ملازمت کے بعد وظیفہ پر سبکدوش ہوئے تو دوسرے ہی روز پولس نے اُن کا چالان اس الزام میں کیا کہ ہائیڈ پارک میں وہ ایک عورت کیساتھ قابل اعتراض حالت میں پائے گئے۔ کسی قسم کے اثر و سفارش سے کام نہیں چلا اور عدالت نے سزائے جرمانہ صادر کردی۔ اسیطرح کینبٹ کونسل کے ایک مستقل معتمد پر بھی پولس نے اسی قسم کا الزام لگایا اور باوجود اُن کے اثر اور رسوخ کے مقدمہ معمولی طور پر چلا۔ انگلستان میں اس قسم کی بیسیوں مثالیں ملینگی۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ قانون کی یہ سختی اور

غیر تغیر پذیری لوگوں کے لئے باعثِ تکلیف ہے۔ اگر کسی شریف آدمی سے اتفاقی طور پر کوئی جرم سرزد ہو جائے تو اس کے یہ معنی نہیں کہ اُسے سزا بھی دیجائے کیونکہ ایسی صورت میں جرم کا اعلان ہی اُس کے لئے کافی سزا ہے۔

عورت

مولوی حیدر رضا صاحب ذاتی طور پر عورتوں کی آزادی کے خلاف ہیں کیونکہ اس سے عورتوں کے اخلاق پر بُرا اثر پڑتا ہے۔ یورپ میں عورتوں کی آزادی کا ادنیٰ مظاہرہ سمندری تفریح گاہوں پر نظر آتا ہے جہاں پر ہزارہا عورتیں نہانے کا حیاسوز لباس پہنے ہوئے اپنے حسن اور رعنائیوں کی نمائش کرتی ہیں۔ اِن عورتوں کی آنکھوں میں نسوانی شرم و حجاب کا شائبہ تک نہیں ہوتا۔ بسا اوقات اس عریاں لباس میں عورتیں بازار جاتی ہیں اور اس لباس میں بعض عورتوں کی شادیاں بھی ہوئی ہیں۔ لباس اِس قدر چُست ہوتا ہے کہ جسم کی ہر چیز آئینہ کی طرح نظر آتی ہے۔

مغربی عورتوں کی آزادی

میرے اِس سوال پر کہ مغربی عورتوں کی اِس آزادی کی کیا وجہ ہو سکتی ہے مولوی حیدر رضا صاحب نے فرمایا کہ اس کے کئی اسباب ہیں۔ سب سے پہلے عورتوں کا معاشی حیثیت سے اپنے پیروں پر کھڑا رہنا ہے جس کی وجہ سے والدین کا اُن پر کوئی اثر نہیں رہا۔ شہروں میں اکثر ملازم پیشہ عورتیں قصبوں اور دیہاتوں سے آتی ہیں۔ اُن کے ساتھ اُن کا کوئی سرپرست نہیں ہوتا اور وہ شہر کی دلچسپیوں میں کھو جاتی ہیں۔ بعض نوجوان لڑکیاں اپنے ضعیف والدین کی پرورش کے خیال سے ملازم ہو جاتی ہیں اور چونکہ ملازمت بڑی مشکل سے ملتی ہے

اس لئے انہیں مجبوراً اپنے بوالہوس آقاؤں کی ہر جائز و ناجائز خواہش پوری کرنی پڑتی ہے۔ ایک جرمن رئیس کے قول کے مطابق انگلستان اور امریکہ کی ہر دوکان ایک حرم سرا ہے۔

عورتوں کے اخلاق خراب ہونے کی ایک اور وجہ ریل، موٹر اور تیز سواریاں ہے۔ غریب گھرانوں کی لڑکیاں عموماً موٹروں میں بیٹھنے کی بڑی شایق ہوتی ہیں اس لئے اگر سر راہ انھیں کسی موٹر میں مفت جگہ دیجائے تو اس کے نتائج پر غور کئے بغیر وہ موٹروں میں سوار ہو جاتی ہیں اور موٹریں تفریح کے بہانہ سے انھیں دور لیکر نکل جاتی ہیں۔ اور بعد میں انھیں معلوم ہوتا ہے کہ اس تفریح کی انھیں بڑی قیمت ادا کرنی پڑی۔ چند دنوں پہلے امریکہ کی بعض نا کتخدا لڑکیوں نے خودکشی کرلی تھی جس کی پولس نے اپنی تحقیقات میں یہ وجہ بتلائی کہ یہ حاملہ ہوگئی تھیں اور ایسے مردوں کے ساتھ ان کی موٹروں میں تفریح کو جایا کرتی تھیں جن کے نام تک انھیں نہیں معلوم تھے۔ اسیطرح اسقاط حمل، خفیہ زچگی یا عاشقی کرنے کے لئے بھی آجکل بڑی سہولتیں پیدا ہوگئی ہیں۔ عورتیں تفریح کے نام سے برّاعظم چلی جاتی ہیں اور کچھ دنوں بعد بغیر کسی بدنامی کے وطن واپس ہو جاتی ہیں۔

ناچنے سے بھی عورت اور مرد کے اختلاط کے زیادہ مواقع پیدا ہوتے ہیں اس لمس جسمانی ہی میں اختلاط کی بہت سی منزلیں طے ہو جاتی ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ یورپ میں عصمت کا کوئی معیار نہیں ہے۔ شادی شدہ اور غیر شادی شدہ دونوں قسم کی عورتوں میں۔ ہندوستان میں متعہ کا اگر کہیں رواج ہے تو چند قیود اور پابندیوں کے ساتھ ہے لیکن یورپ میں تو کوئی

قید ہی نہیں۔ امریکہ میں تو ایک معینہ مدت کے لئے امتحانی شادیاں ہو رہی ہیں۔ انگلستان میں شادی تک اور فرانس میں شادی کے بعد عورتیں اپنے آپکو ہر قسم کے بندھن سے آزاد سمجھتی ہیں۔ انگریز عورتوں کے کردار کی صحیح ترجمانی مشہور شاعر پوپ کے اس مصرعہ سے ہو سکتی ہے کہ " ہر عورت کی ایک قیمت ہے"۔ وہاں کسی عورت کا حاصل کرنا مشکل نہیں البتہ معیار زندگی اور طرز ماند و بود کا فرق ہے۔ عورتوں کی اس آزادی کی وجہ سے اہل یورپ کی ذہنیتوں میں جو تبدیلی واقع ہوئی ہے وہ ذیل کے ایک معمولی واقعہ سے ظاہر ہو سکتی ہے۔ مولوی حیدر رضا صاحب ایک بس میں بیٹھے ہوئے لندن کے مضافات سے تشریف لا رہے تھے۔ راستہ میں ایک اسٹیشن پر کچھ لوگ سوار ہوئے جن میں ایک بوڑھی ماں اور اس کی جوان سال بیٹی بھی تھی۔ ماں کو تو بیٹھنے جگہ مل گئی لیکن بیچاری لڑکی کھڑی رہی۔ چونکہ سفر دور کا تھا ماں نے ادھر ادھر دیکھ کر بہ آواز بلند بیٹی سے مخاطب ہو کر کہا:۔

" بیٹی! تو ایسی کب تک کھڑی رہیگی۔ جا اس نوجوان کی گود میں بیٹھ جا۔ تجھے بیٹھنے جگہ ملجائیگی اور وہ خوش ہو جائیگا"۔

چنانچہ سعادت مند بیٹی نے خوشی سے اچھل کر اپنی ماں کے حکم کی تعمیل کی۔

خانگی زندگی عورتوں کی آزادی کی وجہ سے اہل یورپ کی خانگی زندگی تباہ ہو گئی ہے۔ اگلے زمانہ میں عورت اپنے شوہر کی محکوم سمجھی جاتی تھی اور مشرق میں تو خدا کے بعد شوہر کا درجہ ہے۔ لیکن یورپ میں

حالات بالکل برعکس ہیں۔ وہاں شوہر بیوی کا محکوم سمجھا جانے لگا ہے۔ یورپ میں یہ ایک عام فیشن ہوگیا ہے کہ اپنے مرد احباب کے سامنے عورتیں اپنے شوہروں کا مضحکہ اُڑاتی ہیں اور اُن کی کمزوریوں کو چھپانے کی بجائے اُن کو نمایاں کرکے پیش کرتی ہیں۔ اِسیطرح سیر و تفریح کے لئے عورتیں بہت کم اپنے شوہروں کے ساتھ باہر نکلتی ہیں۔ عورتوں کے ملازمت اختیار کرلینے کی وجہ سے مردوں کو امورِ خانہ داری میں دلچسپی لینی پڑتی ہے ورنہ گھر کا انتظام اور بچوں کی نگہداشت ناممکن ہوجاتی ہے۔

عورتوں کی اِس بڑھتی ہوئی آزادی کو روکنے کے لئے شہر وائنا میں ایک انجمن زن مُریداں قائم ہوئی ہے جس میں یورپ کے تقریباً تمام ممالک کے زن مرید شریک ہیں۔ اِس انجمن کے اغراض و مقاصد یہ ہیں کہ کسیطرح پھر عورتوں پر مردوں کا تسلط قائم ہوجائے۔ جرمنی میں نازی حکومت نے عورتوں پر سخت پابندیاں عائد کردی ہیں۔ ملازمت کے دروازے اُن کے لئے بند کردیئے گئے ہیں اور اُن کے ذمہ گھر کا اِنتظام ہوگیا ہے۔

جنگ عظیم سے ایک سال قبل یعنی ۱۹۱۳ء میں اِنگلستان میں طلاق کی اُوسط تعداد (۶۰۰) سالانہ تھی جو بہت زیادہ سمجھی جاتی تھی۔ آج اِس کا اوسط پانچہزار ہے۔ جرمنی کا اُوسط ۶۰ ہزار، امریکہ کا ایک لاکھ اور روس کا ایک لاکھ بیس ہزار ہے۔ اِنگلستان میں تقریباً ۳/۵ طلاقیں خود عورتوں نے حاصل کیں۔

عورت اور جنگ عظیم

میرے اِس سوال پر کہ جنگ عظیم کا اخلاق پر کیا اثر پڑا آپ نے فرمایا کہ یُورپ میں اَخلاق کا

جنازہ جنگ ہی نے نکالا ہے زمانۂ جنگ میں یورپ کا ہر ملک نوجوانوں سے خالی تھا اور عورتوں کی حالت ناگفتہ بہ تھی۔ چنانچہ جسٹس ڈارلنگ کے بیان کے بموجب جو اُس زمانہ میں لندن ہائی کورٹ کے جج تھے عورتوں کی حالت کا اندازہ سڑکوں پر کیا جا سکتا تھا جہاں وہ مردوں کی تلاش میں ماری ماری پھرتی تھیں۔ اور اُس زمانہ کا یہ فیشن ہو گیا تھا کہ ایک مرد کے ہمراہ سیر و تفریح میں دو عورتیں ہیں۔ مردوں کی اِس قلت کے مدنظر جرمنی میں ایک پمفلٹ شائع ہوا تھا جس میں مردوں کے لئے قانوناً تعدد ازدواج کی حمایت کی گئی تھی۔

بہر کیف یورپ کی عورتوں کی آزادی اور بے راہ روی کو دیکھنے کے بعد یہ کہنا بجا ہوگا کہ عورتوں کو آزاد ہونے کا موقع ہی نہ دیا جائے۔ اُن کی تعلیم پر روپیہ صرف کرنا بیکار ہے اُن کی تعلیم بس اس حد تک ہونی چاہیئے کہ وہ مذہب سے واقف ہو جائیں اور گھر کا روبار آسانی سے سنبھال لیں۔ خود انگلستان میں یہ خیال عام ہو رہا ہے کہ عورتوں کی اعلیٰ تعلیم پر زیادہ رقم نہ صرف کی جائے۔ انگلستان میں اس وقت پانچ ہزار لیڈی ڈاکٹر ہیں اور اِس تعداد میں مزید اضافہ نہ ہونے کے لئے تقریباً تمام طبی کالجوں میں عورتوں کے داخلہ پر تحدید عائد کی گئی ہے۔

مذہب یورپ پر مذہب کا کوئی اثر نہیں۔ تعلیم یافتہ تثلیث کے سمجھنے سے قاصر ہیں یہی وجہ ہے کہ وہاں مرد بہت کم گرجاؤں کو جاتے ہیں اور جو جاتے بھی ہیں تو محض اپنی بیویوں کے جبر سے یا اُن کو خوش کرنے کے لئے۔ لیکن مذہب کا اثر نہ ہونے کے یہ معنی نہیں ہیں کہ وہاں خدا کے پرستار ہی نہیں ہیں۔ خدا ترسی وہاں کے لوگوں کی ایک عام خصوصیت ہے۔ خیرات، ہمدردی۔ ایثار اور

اس قسم کی دیگر خصوصیات میں وہ لوگ ہم سے بہت آگے ہیں۔

یورپ کا مستقبل سر دست یورپ میں انحطاط کے کوئی آثار نظر نہیں آتے۔ اس میں شک نہیں کہ وہاں عیش پرستی زیادہ ہے۔ لیکن اس سے کہیں زیادہ قوم پرستی ہے۔ مسلمانوں کے انحطاط کی اگر کوئی وجہ تھی تو یہ تھی کہ ان میں خدمت عامہ کا جذبہ تقریباً مفقود ہو گیا تھا۔ وہ جو کام کرتے یا تو جلب منفعت کے لئے کرتے تھے یا اپنے آقاؤں یا بادشاہوں کی خوشنودی کی خاطر۔ جب انسان کا مطمح نظر اتنا گر جائے تو ظاہر ہے کہ ذہنی اور تمدنی حیثیت سے اس کا ترقی کرنا محال ہے۔

مولوی حیدر رضا صاحب کا ذاتی خیال ہے کہ کچھ دنوں بعد یورپ سے مستقل شادیوں کا رواج اٹھ جائیگا اور ہر کرسمس کے زمانہ میں مرد اور عورتیں ایک سال کیلئے اپنے رفیق کا انتخاب کر لیا کرینگے۔

تقلید اہل یورپ کی بہت سی چیزیں ہمارے لئے قابل تقلید ہیں لیکن یہ بیک نظر دکھائی نہیں دیتیں اور نہ تین چار سال کے قیام میں ان کا پتہ چلتا ہے۔ یوں تو انکی برائیاں جہاز سے اترتے ہی نظر آنے لگتی ہیں اور ہم ان ہی میں الجھ کر رہ جاتے ہیں۔ ان کی خوبیاں ہمارے لئے پردہ میں رہتی ہیں۔ اسی لئے اس کی ضرورت ہے کہ ہمارے طالبعلم اور سیاح ایسی عمر میں یورپ جائیں جب وہ اپنی خواہشات نفسانی پر قابو رکھ سکتے ہوں اور اس کے لئے کم از کم (۴۰) سال کی عمر کو پہنچنا ضروری ہے۔ علاوہ ازیں یورپ میں دو ایک سال کے قیام سے سطحی چیزوں پر بھی نظر نہیں پڑتی۔ وہاں پانچ دس سال رہنے کی ضرورت ہے جس کے بعد ہی لوگ کچھ صحیح رائے دینے کے قابل ہو سکتے ہیں۔

مولوی سیّد محمد حسین صاحب جعفری

مولوی سید محمد حسین صاحب جعفری بی۔ اے (آکسن) ناظم تعلیمات سرکار عالی ایک وسیع تعلیمی تجربہ کے مالک ہیں۔ آپ نے فن تعلیم پر کئی بلند پایہ کتب و مضامین تحریر فرمائے ہیں۔ آپ کی کتابوں میں سب سے اہم و قابل ذکر "ڈنمارک کا طریقہ تعلیم" ہے۔ یہ کتاب آپ نے بزبان انگریزی ڈنمارک کے حالات کا تفصیلی مطالعہ کر کے تالیف فرمائی ہے۔

اپنے قیام آکسفورڈ میں آپ وہاں کی اِسلامک سوسائٹی کے معتمد اور اُس کے بعد اُس کے صدر نشین رہے اور جنگِ بلقان کے وقت انجمن ہلال احمر کے کام میں عملی حصہ لینے کے لئے آپ ترکی تشریف لے گئے۔

آپ کا قیام انگلستان میں سنہ ۱۲ء تا ۱۶ء رہا۔

خصوصیات اہل یورپ میں اور ہم میں بڑا فرق ہے۔ دُور کیوں جائیے بعض مشرقی ممالک مثلاً ترکی، ایران، مصر و عراق بھی ہم سے بہت زیادہ ترقی یافتہ ہیں۔ ہم پر ابھی جمود کی گھٹا طاری ہے اور قدامت پرستی نے

ہیں تباہ و برباد کر دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم حالات زمانہ کا ساتھ نہیں دے سکتے ہیں۔

اہل یورپ میں خدمت خلق کا مادہ زیادہ ہے اور ہم میں خود غرضی زیادہ ہے۔ وہاں اجتماعی زندگی پر زور دیا جاتا ہے اور یہاں انفرادی زندگی پر۔ اس کی توضیح یوں ہو سکتی ہے کہ اگر ہم کسی ذمہ دارانہ خدمت پر ہوں تو ہماری کوشش یہ ہوتی ہے کہ ہر جائز و ناجائز طریقے سے اپنے قدم جمائے رکھیں خواہ اُس میں بحیثیت مجموعی مفاد عامہ کا نقصان ہی کیوں نہ ہو۔

مذہب یا قومیت

ہندوستان میں مذہب پرستی جنون کی حد تک پہنچی ہوئی ہے۔ ہم نے مذہب کو قومیت بنا لیا ہے اور ہماری قومیت کا دارومدار مسلمان اور ہندو ہونے پر ہے درآنحالیکہ قوم جغرافی حیثیت سے قائم ہوتی ہے۔ ہندوستان میں مذہب کو ہر معاملہ میں اولیت حاصل ہے اور یورپ میں مذہب ایک بالکل شخصی چیز ہے۔ جس طرح ہر شخص کو اختیار ہے کہ وہ اپنے لئے کوئی مشغلہ منتخب کر لے بعینہ یہی حال وہاں مذہب کا ہے۔ اس کی ضرورت نہیں کہ باپ کا جو مذہب ہو وہی بیٹے کا بھی ہو۔ اور نہ مذہب کی وجہ سے دنیوی کاروبار میں کسی قسم کی رکاوٹ پیدا ہوتی ہے۔ اگر میں شیعہ ہوں اور آپ سُنّی ہیں تو اس سے آپس کے تعلقات اور معاملات میں کوئی فرق پیدا نہیں ہوتا۔ اعتقاد کی حد تک آپ کسی مذہب کے پابند رہیں لیکن جہانتک دنیوی معاملات کا تعلق ہے یہ کافی ہے کہ آپ کا ضمیر آپ کا ساتھ دے۔ لیکن ہمارے پاس ایسا نہیں ہوتا۔ ہم نے مذہب کو رحمت کے بجائے زحمت بنا لیا ہے۔

مولوی سید محمد حسین صاحب جعفری نے اپنے حالیہ سفر عراق کا ایک واقعہ

بیان فرمایا کہ عراق کی آبادی مسلمانوں، عیسائیوں اور یہودیوں پر مشتمل ہے لیکن سب کی زبان عربی ہے اور سب اپنے آپ کو پہلے عراقی سمجھتے ہیں۔ جب حکومت عراق نے جبری فوجی بھرتی کے وقت عیسائیوں کو نظر انداز کر دیا تو پچیس تیس ہزار عیسائی نوجوانوں نے دفترِ خارجہ کے سامنے مظاہرہ کیا یہ تبلانے کے لئے کہ عراق کی مدافعت کا فرض مسلمانوں کے برابر عیسائیوں پر بھی عائد ہوتا ہے جس سے وہ محروم نہیں کئے جا سکتے۔ حکومت کو مجبور ہونا پڑا۔ برخلاف اس کے ہمارے پاس اکھاڑے قائم ہوتے ہیں تو ایک دوسرے کا گلا کاٹنے کے لئے۔

ذاتی خصائل عام طور پر یہ خیال ہے کہ یورپ کی اخلاقی حالت خراب ہو گئی ہے۔ یورپین اقوام ظلم و تعدی کے علمبردار ہیں اور کمزور قوموں کی حمایت کی بجائے ان کے خلاف زیادتیاں روا رکھی جاتی ہیں۔ اطالیہ اور جرمنی اس کی زندہ ترین مثالیں ہیں۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ اس قسم کی ظلم اور زیادتی کا تعلق قومی یا عالمی سیاسیات سے ہے۔ انفرادی طور پر وہاں کے لوگوں میں ایثار اور خدمتِ خلق کا مادہ زیادہ ہے اور ان کی یہی خصوصیات ان کی ترقی کی ضامن ہیں۔ گو وہاں کے لوگ مذہب کے اتنے پرستار نہیں ہیں لیکن مذہب کی تعلیمات سے کسی شخص میں جو اچھائیاں پیدا ہو سکتی ہیں وہ اُن میں بدرجہ اتم موجود ہیں۔ وہاں کے رفاہی اور خیراتی اداروں کی تعداد کو دیکھکر تعجب ہوتا ہے۔ مشرق میں بہت سے ایسے لوگ ملینگے جو صوم و صلواۃ کے پابند، متشرع، عالم سب ہی کچھ ہیں لیکن اُن کی ذات سے ان کے سوا کسی کو کوئی فائدہ نہیں پہنچتا۔ پھر ایسی مذہبیت سے کیا فائدہ جب اِنسان اپنے سوا دوسروں کے کام نہ آسکتا ہو۔

انگریزوں کی ذاتی خصوصیات

انگریز دنیا کی بہترین قوموں میں سے ہیں۔ سنجیدگی، توازنِ دماغی اور حکمت عملی میں یہ لوگ اپنا ثانی نہیں رکھتے۔ ہندوستان پر ڈیڑھ سو سال کے انگریزی تسلط کے بعد بھی ہندوستانیوں کو انگریزوں کے توازنِ دماغی کی ہوا نہیں لگی۔ معمولی معمولی چیزوں پر ہم الجھ جاتے ہیں اور بجائے تعمیر کے تخریب کی صورت پیدا کر دیتے ہیں۔ ہمارے نوجوانوں کو چاہیئے کہ سب سے پہلے انگریزوں کی یہ خصوصیت اپنے آپ میں پیدا کریں۔ بعض ماہرینِ نفسیات کا خیال ہے کہ ہندوستان ایک گرم ملک ہونے کی وجہ سے ہمارے جذبات جلد برانگیختہ ہوتے ہیں۔ ممکن ہے یہ ایک حد تک صحیح ہو لیکن اگر کسی چیز کے حصول کی کوشش کی جائے تو اس کا حاصل کرنا مشکل نہیں ہے۔

تعلیم

جنگ عظیم کے بعد یورپ کے حالات میں جو زبردست ردّ عمل ہوا اس سے یورپین ممالک نے محسوس کیا کہ ملک کی سب سے بڑی دولت نوجوان ہیں تعلیم یافتہ اور صحت مند۔ آج یورپ کے ہر ملک میں نوجوان اور ان کی تعلیم و تربیت پر غیر معمولی توجہ صرف کی جا رہی ہے۔

دماغی اور جسمانی تعلیم کو برابر کی اہمیّت حاصل ہے۔ مغربی درسگاہوں میں اوقات مدرسہ میں طلبا کے لئے کھانے کا مفت اِنتظام کیا جاتا ہے اور اُنھیں بہترین غذا دی جاتی ہے۔ اُن کا مفت طبی معائنہ ہوتا ہے اور ان کے لئے صحت خانے clinics قائم کئے گئے ہیں۔

ہر متمدن حکومت کا فرض ہے کہ وہ ہر فرد کو ابتدائی تعلیم دلائے۔ یورپ میں ابتدائی تعلیم کی حد تک حکومتیں ساری ذمہ داری قبول کرتی ہیں۔ ثانوی اور اعلیٰ

تعلیم کے لئے خانگی کوششوں اور خانگی سرمایہ کو دخل ہے۔ برطانیہ عظمیٰ کی آبادی تقریباً ساڑھے چار کروڑ نفوس پر مشتمل ہے اور وہاں صرف ابتدائی تعلیم کا خرچ دس کروڑ پونڈ سالانہ ہے گویا فی کس تعلیم کا خرچ دو پونڈ یا تیس روپیہ ہوتا ہے۔ ہماری ریاست کی آبادی ڈیڑھ کروڑ کے قریب ہے اور تعلیم پر تقریباً ایک کروڑ روپیہ صرف ہوتا ہے۔ اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ تعلیمی معاملات میں ہم کس قدر پیچھے ہیں۔ ہندوستان میں فوج پر جو کثیر رقم صرف کی جاتی ہے کاش وہ نوجوانوں کی تعلیم پر صرف کی جاتی کیونکہ کسی ملک کی بڑی فوج اس کے نوجوان ہیں اور جب یہ تعلیم یافتہ اور روشن ضمیر ہوں تو پھر اس فوج کے ہوتے ہوئے اس ملک کو کوئی دشمن آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھ سکتا۔

عورت

ہندوستانی عورتوں میں مغربی عورت کی تقلید بڑی اچھی چیز ہے لیکن تقلید صرف اچھائیوں کی حد تک ہونی چاہیئے۔ ہماری عورتوں کو سب سے پہلے کفایت شعارانہ زندگی کا عادی بننا چاہیئے۔ غیر معمولی قیمتی لباس زیب تن کرنا، بناؤ سنگھار اور نمائش پر جان دینا، گھر کا کاروبار چھوڑ کر پارٹیوں اور سوسائٹیوں میں شریک ہونا ایسی چیزیں ہیں جو نہ صرف ہندوستان میں بری نظروں سے دیکھی جاتی ہیں بلکہ یورپ میں بھی انہیں معیوب سمجھا جاتا ہے۔

یہ خیال کہ یورپ کی ہر عورت عصمت باختہ ہے غلط ہے۔ وہاں عورت اور مرد مساوی طور پر آزاد ہونے کی وجہ سے عورت میں عصمت کا خیال زیادہ ہے۔ اگر کسی شخص کو ہمیشہ کمرہ میں بند رکھا جائے اور اس کے متعلق یہ کہا جائے کہ وہ انتہائی نیک چلن ہے تو یہ ایک قسم کی ستم ظریفی ہے۔ نیک چلنی یا بد چلنی کا

اندازہ تو اس وقت ہو سکیگا جب وہ شخص ہر قسم کے قید و بند سے آزاد رہنے کے بعد اپنے دامن کو معصیت سے آلودہ نہ کرے۔ بعینہٖ یہی حال ہماری عورتوں کا ہے۔

یورپ میں دو قسم کے لوگ ہیں۔ ایک وہ جو رین بسیروں کے دلدادہ ہیں اور دوسرے جو لہو و لعب میں حصہ نہیں لیتے۔ اونچے طبقوں میں عیش پرستی زیادہ ہے۔ لیکن متوسط اور اعلیٰ متوسط طبقہ انگریزی سوسائٹی کی ریڑھ کی ہڈی اور اُسکی جان ہے انگریزوں کی ساری قومی خصوصیات، روایات اور احساسات کا یہی طبقہ آئینہ دار ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر انگریز عورت بد اخلاق ہوتی جیسا کہ عام طور پر سمجھا جاتا ہے تو یہ قوم زندہ بھی نہیں رہتی۔ کیا تاریخ سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ عیش پرستیوں اور بد اخلاقیوں سے قومیں تباہ و برباد ہو جاتی ہیں۔

مسلمان عورتوں کے مقابلہ میں ہندو عورت کی زندگی بہت کفایت شعارانہ ہے۔ پونہ و بمبئی میں کئی نسوانی ادارات و مدارس ایسے ہیں جہاں اعلیٰ تعلیم یافتہ ہندو عورتیں معمولی معمولی معاوضہ پر کام کرتی ہیں اور اُنکے اس ایثار اور محنت پسندی میں ایک نئی قوم جنم لے رہی ہے۔

ہماری عورتوں کی ترقی بڑی حد تک مردوں کی ذہنیتوں کی تبدیلی پر منحصر ہے۔ غیر عورتوں یا اُن عورتوں کے متعلق جو بے پردہ ہیں ہمارے خیالات اتنے ارفع و اعلیٰ نہیں ہوتے جتنے کہ خود اپنے گھر کی عورتوں کے متعلق ہوتے ہیں۔

خاتمہ آخر میں مولوی سید محمد حسین صاحب جعفری نے فرمایا کہ ہندوستان کی ترقی کے لئے سخت ترین اصلاحات کی ضرورت ہے۔ ترکی کی مثال ہمارے سامنے ہے۔ آج سے دس سال قبل ایرانیوں کی حالت ناگفتہ بہ تھی۔

وہ افیون اور قہوہ کے عادی تھے۔ افلاس زدہ، جاہل اور خوابیدہ۔ لیکن رضا شاہ نے ان میں زندگی کی روح پھونک دی ہے۔ اس بیداری کی بجز اس کے کوئی وجہ نہیں کہ رضا شاہ نے ملک کے لئے جس اصلاح کی بھی ضرورت محسوس کی اس کو بغیر کسی پس و پیش کے نافذ کر دیا گیا اور اس سے سرتابی کرنے والوں کو سخت ترین سزائیں دیگئیں۔ ترکی میں اتاترک اور ایران میں رضا شاہ نے لوگونکی ذہنیتوں اور ان کے نصب العینوں کو بدل دیا ہے اور ایک تاراج اور مفلوک حال قوم سے ایک زندہ اور الوالعزم قوم کو پیدا کیا۔

مولوی محمد عبدالرحمن خاں صاحب

مولوی محمد عبدالرحمٰن خان صاحب بی۔ اے۔ بی۔ یس۔ سی (لندن) اے۔ آر۔ سی۔ یس کی علمی، تعلیمی و ملکی خدمات کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ بحیثیت صدر کلیہ جامعہ عثمانیہ بارہ سال تک آپ نے جس جوش اور خلوص سے اس نوخیز جامعہ کو صحیح راستوں پر گامزن کیا ہے اور نوجوانان ملک کی قسمتوں کی رہنمائی فرمائی ہے آپ کے اس احسان سے جامعہ اور حیدرآباد کبھی عہدہ برآ نہیں ہو سکتا۔

آپ ہندوستان کے ایک مسلمہ سائنس داں ہیں۔ اور سائنس کی متعدد بلند پایہ نصابی کتب کو آپ نے اردو میں منتقل فرمایا ہے۔ وظیفہ کے بعد آپ بالکلیہ علمی اور سائنٹفک کاموں کے لئے وقف ہو گئے ہیں۔ آپ کے مضامین و مشاہدات مشہور امریکی و برطانوی جرائد میں شائع ہوتے ہیں۔ حیدرآباد ایجوکیشنل کانفرنس کی گذشتہ میقات کے آپ صدر تھے۔

آپ کا قیام انگلستان میں ۱۱ء تا ۱۴ء رہا۔ ۲۷ء میں بھی آپ نے دوسری مرتبہ یورپ کا سفر فرمایا ہے۔

عام خصوصیات اکثر یورپی اقوام اور خصوصاً انگریز بہت سی ایسی خوبیوں کے حامل ہیں جو ہم میں موجود نہیں ہیں۔ ان لوگوں کی تعلیم و تربیت اور نشو و نما ہی کچھ اس قسم کی ہوتی ہے کہ وطن پروری، اولوالعزمی، شجاعت، ہمدردی، ایثار، عزت نفس، خودداری، ضبط و تنظیم جیسی خصوصیات ان کی فطرت میں رچ گئی ہیں ان چیزوں کا عمومیت سے ہر کس و ناکس میں موجود رہنا ہی اس بات کی دلیل ہے کہ یورپ ہمارے مقابلہ میں کتنا ترقی یافتہ ہے۔

باقاعدگی باقاعدگی، وقت کی قدر اور اصول کی پابندی یہاں کی زندگی کے عام نصب العین ہیں۔ معمولی معمولی چیزوں میں اتنی باقاعدگی برتی جاتی ہے کہ اس سے انگریزوں کی عام تنظیمی قابلیت کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ ایک معمولی تفریح (picnic) کو بھی نکلتے ہیں تو لوگ پہلے ہی سے اس کا پروگرام بنا لیتے ہیں اور اگر کوئی دور دراز کا سفر ہو تو راستوں کا نقشہ تک تیار کر لیا جاتا ہے۔ تفریح کے لئے اگر زیادہ لوگ جا رہے ہیں تو ایک لیڈر کا بھی انتخاب کر لیا جاتا ہے جس کے احکام کی ایسی ہی تعمیل ہوتی ہے جیسے سپاہی اپنے افسر کے حکم کی تعمیل کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اپنے پروگرام سے یہ لوگ رمق برابر ہٹنے نہیں پاتے۔

انگریز وقت کی بڑی قدر کرتے ہیں۔ کوئی شخص بیکار نظر نہیں آتا۔ دولتمند اور ذی ثروت لوگ بھی جنھیں بجز عیش کے کوئی کام نہیں، کچھ نہ کچھ قومی اور رفاہی کام اپنے ذمہ لے لیتے ہیں یا اپنے لئے کوئی ایسا مشغلہ منتخب کرتے ہیں کہ ان کا وقت بیکار نہیں جاتا۔ اس ضرب المثل سے کہ ایک بیکار دماغ شیطانی کارخانہ ہوتا ہے وہ خوب واقف ہیں اور اپنے آپ کو ہمیشہ مصروف رکھتے ہیں مبادا ان کا دماغ

شیطان کی آماجگاہ بن جائے۔

کفایت شعاری

انگریز انتہائی کفایت شعار ہوتے ہیں اور ایک ایک کوڑی جمع کرتے ہیں۔ دولت کی قدر کرنے ہی سے یہ لوگ دولتمند ہیں۔ کفایت شعاری کا ذکر کرتے ہوئے مولوی عبدالرحمٰن خاں صاحب نے ایک معمولی واقعہ بیان فرمایا جس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ بچپن ہی سے اس عادت کو کس طرح راسخ کیا جاتا ہے۔ انگلستان پہنچنے کے بعد ایک خاندان میں آپ کی رہائش کا انتظام ہوا۔ پہلی مرتبہ جب آپ نے اس مکان میں قدم رکھا تو چائے کا وقت تھا میز پر خاندان کے سارے ارکان اور بچے جمع تھے۔ آپ بھی شریک کر لئے گئے۔ آپ کے لئے چائے بناتے ہوئے مالک مکان نے دریافت کیا کہ آیا آپ کو شکر کی ایک ڈلی (مکعب) کافی ہو جائیگی یا دو؟ آپ نے فرمایا "دو"۔ اس کے بعد بچوں کی باری آئی۔ سب سے بڑے لڑکے نے 'ایک' کہا اور چھوٹوں نے تو شکر لینے ہی سے انکار کر دیا۔ آپ تعجب سے بچوں کی صورت دیکھنے لگے تو والدین کا رعب ان پر ایسا طاری تھا کہ کسی کو زبان ہلانے کی ہمت نہ ہوتی تھی حالانکہ شکر کے لئے ان کا کلیجہ منہ کو آرہا تھا۔ یہ دراصل ان کی تربیت کا نتیجہ ہے۔ یہاں کی طرح نہیں کہ بچہ جو ضد کرتا ہے اس کو پوری ہی کر کے رہتا ہے اور رفتہ رفتہ والدین کے لاڈ پیار سے تباہ ہو جاتا ہے۔

صفائی اور نفاست پسندی

انگریزوں کی صفائی اور نفاست پسندی کے متعلق آپ نے ایک واقعہ اس طرح بیان فرمایا کہ ایک روز آپ اپنے کمرے میں بیٹھے پنسل تراش رہے تھے۔ کمرے کا

مالکہ مکان کی موجودگی کا آپ کو علم نہ تھا۔ جوں ہی اس پر نظر پڑی تو آپ نے دیکھا کہ وہ آپ کے قریب گھٹنوں کے بل کھڑی ہے اور قلم کے ریزوں کو اپنی ہتھیلی میں جمع کرتی جارہی ہے۔ جب آپ نے اس کی اس حرکت پر تعجب کا اظہار کیا تو وہ کہنے لگی کہ کیا انکو فرش پر پڑے رہنے دینے سے باہر پھینکدینا اچھا نہیں ہے۔ اس واقعہ سے آپ استنے متاثر ہوئے کہ اس عورت سے زیادہ کمرے کی صفائی کا آپ کو خیال ہوگیا۔

انگلستان میں اکثر مکانوں میں غسل خانے نہیں ہوتے۔ لوگ عام طور پر اِتوار کو نہاتے ہیں یا اسپنج باتھ پر اکتفا کرتے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود صفائی کا بڑا خیال رکھا جاتا ہے گو مشرقی نقطۂ نظر سے یہ صفائی ظاہری ہوتی ہے۔

آزادئ نسواں میرے اس سوال پر کہ جنگ کے پہلے اور بعد عورتوں کے حالات میں کیا نمایاں تغیر واقع ہوا مولوی محمد عبدالرحمٰن خاں صاحب نے فرمایا کہ جنگ عظیم سے پہلے عورتیں ہر قسم کے قید و بند سے آزادی حاصل کرنے کی کوشش میں مصروف تھیں اور جنگ کے بعد انھوں نے اس مقصد میں کامیابی بھی حاصل کرلی۔ چنانچہ آج انگلستان میں عورتیں ہر کام میں مردوں کے دوش بدوش ہیں۔ لیکن جب معاشی حیثیت سے عورت اور مرد ایک سطح پر آجائیں تو لازمی طور پر گھر کی زندگی تباہ ہوجاتی ہے اور یورپ میں آج اسی کا ماتم ہے۔ ہندوستان کے گھر کی زندگی اور آسودگی یورپ میں خواب و خیال ہیں۔ آزادی اور انفرادی ذمہ داری کے احساس نے وہاں کے ہر شخص کو خواہ مرد ہو یا عورت اپنے سیاہ و سفید کا مالک بنادیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ پست طبقوں میں والدین

اپنی اولاد پر قابو نہیں رہا۔ لڑکی اگر رات میں دیر سے گھر واپس آتی ہے تو اس سے کوئی پوچھنے والا نہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ اس بے راہ روی سے جو معاشری خرابیاں پیدا ہو رہی ہیں اس سے سوسائٹی کو گھن لگ گیا ہے۔ انگلستان میں عام طور پر ادنیٰ طبقہ اور مزدوروں کی خانگی زندگی اور اخلاقی حالت پست ہے۔ ملازم پیشہ لوگوں میں بالعموم عورتیں کماتی ہیں اور مرد کھاتے ہیں۔

مغربی عورتوں کی ان حیاسوزیوں کے باوجود اُن کے عیوب پس پردہ ہیں اور ہماری حالت اس کے بالکل برعکس ہے۔ خانگی زندگی خواہ کتنی ہی خراب کیوں نہ ہو لیکن پبلک زندگی میں یورپ کے ہر شخص کے ہاتھ سے قومی خصوصیات کا دامن نہیں چھوٹتا۔ وطن پروری، ضبط و نظم اور ہمدردی میں یہ لوگ آپس میں یکساں نظر آتے ہیں۔ اور یہی اُن کی ترقی کا راز ہے۔

مذہبی رجحانات

اہل یورپ کے مذہبی رجحانات کے متعلق آپ نے فرمایا کہ یورپ کا کوئی مذہب نہیں۔ انگلستان میں پراٹسٹنزم سرکاری طور پر ملک کا مذہب تسلیم کیا جاتا ہے۔ لیکن یہ برائے نام ہے۔ عوام کا دراصل کوئی مذہب نہیں۔ اگر ایک طرف دنیا کی مادی ترقیوں نے مذہب کو دیوالیہ کر دیا ہے تو دوسری طرف لوگوں کی کاروباری مصروفیت اتنی بڑھ گئی ہے کہ اُن کو خدا کے متعلق سوچنے کا وقت ہی نہیں ملتا۔ علوم و فنون کی غیر معمولی اشاعت سے ہر چیز عقل و خرد کی کسوٹی پر پرکھی جاتی ہے۔ اس لحاظ سے کہا جا سکتا ہے وہاں کوئی شخص حضرت ابن مریمؑ کو خدا کا بیٹا ماننے تیار نہیں ہے۔

مذہبی نقطۂ نظر سے اہل یورپ میں جو اچھائیاں نظر آتی ہیں وہ براہ راست

مذہبی اثرات کا نتیجہ نہیں ہیں۔ کیونکہ وہاں ہر چیز کے افادی پہلو پر نظر کی جاتی ہے۔ جھوٹ نہ بولنے کی وجہ اللہ اور رسول کا ڈر نہیں ہے بلکہ وہ برے نتائج ہیں جو عملاً جھوٹ بولنے سے پیدا ہوتے ہیں۔ یہی حال دوسری چیزوں کا ہے۔ مادہ پرست ہونے کی وجہ سے وہ لوگ ہر شئے کو مادی نقطہ نظر سے دیکھتے ہیں۔ ہر شخص یہ محسوس کرتا ہے کہ اپنی قوم کی بقاء کے لئے اسے دنیا میں کچھ کرنا ہے چنانچہ ایک معمولی سڑک جھاڑنے والے میں بھی اتنا قومی احساس ہے کہ وہ کوئی ایسا کام نہیں کرے گا جو بحیثیت مجموعی قومی مفاد کے مغائر ہے۔

یورپ میں خدا کے بعد یا اس کے برابر اگر کسی کا درجہ ہے تو وہ روپیہ ہے۔ اور وہاں کا ہر متنفس اس قاضی الحاجات کا سچا اور حقیقی پرستار ہے۔

ذاتی خصوصیات

جہاں تک مختلف یورپی اقوام کی خصوصیات ذاتی کا تعلق ہے یہ کہا جاسکتا ہے کہ انگریز سب سے زیادہ قابل اعتماد ہیں۔ فرانسیسی جتنے جلد دوست بنتے ہیں اتنے ہی جلد بھول بھی جاتے ہیں۔ انگریز بہت مشکل سے دوست بنتے ہیں لیکن دوستی کے بعد آخر دم تک اُسے نبھانے کی کوشش کرتے ہیں۔ جس طرح ایک انگریز خود فضول خرچ نہیں ہوتا وہ اپنے کسی دوست کو بھی فضول خرچ نہیں دیکھ سکتا۔ جس طرح دوستی میں انگریز مشہور ہیں اسیطرح ان کی دشمنی بھی سخت ہوتی ہے لیکن وہ کینہ پرور نہیں ہوتے۔ کسی چیز کو معاف کردیں گے لیکن اُسے بھولینگے نہیں۔

خاتمہ عہد حاضر کی جملہ ترقیوں کے باوجود یورپ ابھی اس درجۂ کمال کو نہیں پہنچا جہاں مسلمان اپنے عروج کے زمانہ میں پہنچے تھے اور نہ اس کا کوئی امکان ہے۔ قرون اولیٰ کے مسلمانوں کی تنظیم، عزم و استقلال، رواداری، راست بازی، خودداری اور دیگر خصوصیتوں سے دنیا ہمیشہ درس بصیرت حاصل کرتی رہیگی۔

ڈاکٹر سیّد حسین

ڈاکٹر سید حسین متمدن دنیا میں بحیثیت جرنلسٹ، مقرر، و سیاست داں بے حد مشہور و مقبول ہیں۔ آپ ہندوستان میں اخبار "انڈیپنڈنٹ" اور امریکہ میں "نیو اورینٹ میگزین" کے ایڈیٹر تھے۔ ڈاکٹر سید حسین ہندوستانی وفد کے اُن تین ارکان میں سے ایک ہیں جو صلحنامہ سیورس کے وقت ترکی سے متعلق ہندوستانی زاویۂ نظر کو پیش کرنے یورپ روانہ کیا گیا تھا۔ واشنگٹن کانفرنس میں آپ نے ہندوستانی صحافت کی نمائندگی بھی کی ہے۔

گذشتہ سترہ اٹھارہ سال سے آپ امریکہ میں متوطن اور وہاں کی جنوبی کیلفورنیا کی جامعہ میں اسلامی تاریخ و تمدن ہند کے لکچرار ہیں امریکہ میں آپ کی حیثیت ہندوستان کے ایک غیر سرکاری سفیر کی ہے اور "مادر ہند" جیسی کتابوں کے مبالغہ آمیز پروپگنڈے کے ازالہ میں آپ نے نمایاں حصہ لیا ہے۔

ڈاکٹر سید حسین گذشتہ سال ایک تقریری سفر کے سلسلہ میں ہندوستان تشریف لائے تھے اور جامعہ عثمانیہ کے زیر اہتمام حیدرآباد میں بھی آپ کی توسیعی تقاریر ہوئی ہیں۔

اختلافات دنیا میں ہندوستان اور ممالک متحدہ امریکہ کی طرح کوئی دو ملک ایسے نہیں ہیں جن میں اتنے نمایاں اختلافات پائے جاتے ہوں ہندوستان دنیا کی قدیم ترین تہذیب وتمدن کا وارث ہے۔ ممالک متحدہ امریکہ دنیا کا نوخیز ترین ملک ہے۔ زندگی کے متعلق ہندوستانیوں کا نقطۂ نظر ایک وسیع بالغ نظری پر مبنی ہے اور ممالک متحدہ امریکہ کا نقطۂ نظر ایک جوشیلے نوجوان کا نقطۂ نظر ہے۔ ہندوستان میں پدرم سلطان بود کی ذہنیت عام طور پر موجود ہے لیکن خوش قسمتی سے امریکہ کا کوئی ماضی ہی نہیں ہے۔ ان کے گرد وپیش ایک زندہ حال ہے۔ اہل امریکہ خود مختار، آزاد اور قوم پرور ہیں۔ ہندوستانیوں کی زندگی اس کے بالکل برعکس ہے۔ پیدائش ہی سے امریکہ کا ہر بچہ ملک، قوم اور قومی پرچم پر فخر کرنا سیکھتا ہے۔ لیکن ہندوستان کے ماضیٔ قریب میں ایسی کوئی قوم پرورانہ بات نظر نہیں آتی۔ امریکی طریقۂ تعلیم ایسے اصولوں پر مبنی ہے کہ اس سے متذکرۂ بالا چیزوں کے حصول میں مدد ملتی ہے اور ہندوستان میں برطانوی طریقۂ تعلیم کی ہو بہو نقل اتارنے سے کوئی سودمند نتیجہ برآمد نہیں ہو سکتا۔ ہر امریکی تعلیمی ادارہ میں روزانہ ممالک متحدہ امریکہ کے پرچم کو سلامی دی جاتی ہے لیکن وائے نصیب! ہندوستان کا کوئی قومی پرچم ہی نہیں جس کو قانون ملک یا اقوام عالم تسلیم کریں۔ ہندوستانی نوجوان اپنے ملک سے محبت کا اظہار کرتے ہوئے جھجکتے ہیں کیونکہ اس کے معنی سزائیں بھگتنا اور تکلیفیں اٹھانا ہے۔

جماعتیں اور اختلافات اہل امریکہ میں اپنی جماعتیں بھی ہیں اور ان کے آپس کے اختلافات بھی ہیں لیکن یہ ساری چیزیں خوشگوار قسم کی ہیں۔ ہندوستان میں یہ بات نہیں ہے۔ یہاں اختلافات

اس قسم کے ہیں کہ ان سے کوئی ٹھوس اور بنیادی کام انجام نہیں پا سکتا۔

ممالک متحدہ امریکہ کی ڈیڑھ سو سال کی تاریخ نے جمہوریت کی تعمیر کے سلسلہ میں مختلف قوموں کو ایک خاص رشتہ اتحاد میں منسلک کر دیا ہے۔ گو ابتدا میں انگریز، فرانسیسی، ہسپانوی کی تفریقیں تھیں لیکن آجکل ہر شخص حقیقی معنوں میں امریکی ہے اور ان میں کسی قسم کے نسلی امتیازات باقی نہیں رہے۔ اس طرح ممالک متحدہ امریکہ ہندوستانیوں کے لئے ایک دلچسپ نمونہ ہے۔ امریکہ میں بیسوں مذہبی فرقے ہیں اور ہر ایک کو کامل آزادی حاصل ہے۔ لیکن ہندوستان میں مذہبی اعتقادات کو فرقہ واری مناقشات کی بنا کیوں قرار دیا جاتا ہے؟ اس پر ڈاکٹر سید حسین نے تعجب کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا کہ بحیثیت اُستاد آپ نے ہزاروں امریکی لڑکے اور لڑکیوں کو دیکھا ہے جو آپ کی جماعتوں میں سے تعلیم پا کر نکلتے رہے ہیں لیکن آپ نے ایک بھی مثال ایسی نہیں دیکھی کہ کسی خاص مذہب کے پیرو ہونے کی وجہ سے کسی کے ساتھ حقارت آمیز سلوک کیا گیا ہو۔ ہندوستان میں جس قسم کا مذہبی تعصب ہے وہ امریکہ میں ناپید ہے۔ یہاں لوگ کتّے اور بلیوں کی طرح لڑتے ہیں۔

معاشری نفسیات ممالک متحدہ امریکہ میں تعلیم یافتہ لوگوں کا اوسط بہت زیادہ ہے۔ ۹۹ فیصد امریکی تعلیم یافتہ ہیں۔ بچوں کے مدرسہ بھیجنے کے لئے ایک قانون نافذ کیا گیا ہے جس کے بموجب والدین بچوں کو مدرسہ بھیجنے کے لئے مجبور ہیں۔ اس قانون کی خلاف ورزی کی صورت میں اُنھیں عدالت کے روبرو پیش کیا جاتا ہے اور اگر اطمینان بخش توجیہہ نہ پیش کی جائے تو اُنھیں جیل خانہ جانا پڑتا ہے۔ امریکہ کے تعلیم یافتوں کی تعداد کا اندازہ یوں کیا جا سکتا ہے کہ وہاں بے پڑھے

لکھے لوگوں کی جتنی تعداد ہے اتنی ہی ہندوستان میں پڑھے لکھوں کی ہے۔ ڈاکٹر سید حسین نے فرمایا کہ وہ یہ سن کر خوش ہونگے اگر انگریز ہندوستان میں بچوں کو مدرسہ نہ بھیجنے کی علت میں ان کے والدین کو جیل بھیجا کریں۔ لیکن یہاں پر تو جیلخانے ہزاروں کی تعداد میں کسی اور قسم کے جرم کی پاداش میں بھرے جاتے ہیں۔

ممالک متحدہ امریکہ میں ہر فرد کو مساوی موقعے حاصل ہیں۔ وہاں والدین کی دلی تمنا رہتی ہے کہ ان کا بچہ ممالک متحدہ کا صدر بنے اور اس مقصد کے حصول میں کوئی مشکلات بھی نہیں ہیں۔ قانون کی نظر میں سب ایک ہیں۔ مساوات کا یہ عالم ہے کہ وہاں ایک جماعت کو دوسری جماعت پر ترجیح حاصل نہیں ہے۔ حکومت کی جانب سے کسی شخص کو کوئی خطاب یا اعزاز عطا نہیں کیا جاتا اور نہ اہل امریکہ کو غیر ملکی خطابات یا اعزازات قبول کرنے کی اجازت ہے کیونکہ اس سے لوگوں میں چھوٹے بڑے کا امتیاز پیدا ہوتا ہے۔ لوگ اگر صدر جمہوریہ کا بھی نام لیتے ہیں تو محض روزولٹ یا مسٹر رزولٹ کہتے ہیں۔ غرض امریکہ دنیا کے تمام ممالک حتیٰ کہ برطانیہ عظمیٰ سے بھی سیاسی، سماجی، معاشی و اقتصادی معاملات میں پچاس سال آگے ہے۔

امریکہ میں آقا اور ملازم کے تعلقات ہم سے بہت مختلف ہیں۔ آقا اپنے ملازم کے ساتھ کبھی غیر شائستہ الفاظ استعمال نہیں کرے گا اور نہ ہی ملازم ان کو برداشت کر سکتا ہے۔ وہاں کی معاشری نفسیات بالکل مختلف ہے۔ وہ آزاد مرد اور عورتوں کی قوم ہے۔ حتیٰ کہ انگریزوں کی معاشری نفسیات بھی امریکہ کے مقابلہ میں ایک صدی پیچھے ہے۔

دوسری اقوام کی طرح امریکی لڑکے اور لڑکیوں کا کوئی ماضی نہیں ہے۔ انکو

حال سے واسطہ ہے۔ معمولی انسانوں کی طرح زندگی بسر کرنے میں وہ لوگ اتنے مصروف ہیں کہ انھیں ماضی کی الجھنوں میں پھنسنے کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ یہ تو صرف ہندوستان ہے جہاں ماضی پر تکیہ کیا جاتا ہے اور لوگوں کو معمولی انسانوں کی طرح زندگی بسر کرنے کا وقت نہیں ملتا۔

عورت ڈاکٹر سید حسین نے فرمایا کہ عام طور پر امریکہ کی عورتوں کے متعلق سمجھا جاتا ہے کہ وہ حد سے بہت آگے نکل گئی ہیں اور ان کی اخلاقی حالت گری ہوئی ہے۔ یہ خلاف واقعہ ہے۔ اس میں شک نہیں کہ وہاں اس قسم کی عورتیں ضرور موجود ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ امریکی نسوانیت نے تہذیب کا ایک ایسا اعلیٰ معیار حاصل کیا ہے کہ کوئی دوسرا ملک اس کا مقابلہ نہیں کرسکتا۔ امریکی عورتوں کو وہی مواقع حاصل ہیں جو مردوں کو ہیں۔ ان کے اپنے انفرادی مشاغل حیات ہیں۔ جامعات میں عورتوں کے لئے زندگی کے مختلف پیشوں کی تعلیم کا انتظام ہے۔ امریکہ کا طریقہ تعلیم ہی کچھ اس قسم کا ہے کہ اس کا مقصد ہی یکساں طور پر تمام عورتوں کی حالت سدھارنا ہے تاکہ وہ اپنی روٹی آپ کما سکیں۔ ہندوستان یا دوسرے ممالک میں اکثر صورتوں میں شادی عورت کے لئے اس کی روٹی کا ذریعہ ہوتی ہے۔ چونکہ امریکہ میں مرد اور عورت ایک سطح پر ہیں وہاں کی عورت روٹی سے شادی نہیں کرتی بلکہ مرد سے شادی کرتی ہے۔ دنیا کے کسی دوسرے ملک کے مقابلہ میں امریکہ میں ہزاروں ایسی عورتیں ہیں جو اپنا پیٹ آپ پالتی ہیں۔ وہاں کے طریقۂ تعلیم سے انھیں بڑی مدد ملتی ہے۔ وہاں ہم تعلیمی کا طریقہ رائج ہے جس میں کسی قسم کی بداعتدالیاں پیدا ہونے کا احتمال نہیں ہے۔ اور یہ پیدا ہوں تو کیوں ہوں؟

بدقسمتی سے ہمارے پاس اور بہت سی اہم چیزوں کو چھوڑ کر جنس کو مضحکہ خیز اہمیت دیدی گئی ہے یہی وجہ ہے کہ ہندوستان اور دوسرے ممالک میں جنسی خیالات غیر متوازن اور ناساز گار ہیں۔ برٹرینڈ رسل نے جس کے پیش نظر خاص ہندوستان کی مثال تھی شوہر اور بیوی کے تعلقات کو پولس اور چور کے تعلقات سے تشبیہ دی ہے۔ ہندوستان اور دوسرے ممالک میں کسی نہ کسی صورت میں غاروں میں رہنے والے ابتدائی انسانوں کی ذہنیت پائی جاتی ہے۔

نسلی تعصب امریکہ میں رنگ اور نسل کا مسئلہ پہلے کی طرح شدید نہیں رہا ہے دو ایک جنوبی ریاستوں میں ایک حد تک یہ چیز پائی جاتی تھی لیکن آجکل تو بعض وفاقی عہدوں پر بھی حبشی مامور ہیں اور آئندہ ربع صدی میں امریکہ میں حبشی مسئلہ کا وجود بھی باقی نہیں رہیگا۔

امتناع مسکرات امریکہ میں امتناع مسکرات میں اس لئے ناکامی ہوئی کہ آبادی اکا بڑا حصہ شراب نوشی کی تائید میں تھا۔ امتناع کا قانون بھی دراصل ایک قلیل جماعت کی وجہ سے منظور و نافذ ہوا تھا جو جنگ کے بعد بڑی طاقتور ہوگئی تھی۔ نفاذ قانون کے وقت بھی کثرت رائے مے نوشی کی حامی تھی۔ مگر اس قانون کی تنسیخ کے بعد لوگوں نے اطمینان کا سانس لیا۔

ملکی قوانین و بین الاقوامیت امریکہ میں توطن پذیری کے خلاف اس لئے قوانین نافذ کئے گئے کہ امریکی اپنے معیار زندگی اور معاشری مرتبت کو بیرونی اثرات سے محفوظ رکھنا چاہتے ہیں۔

اِس سوال پر کہ بین الاقوامیت کے متعلق امریکہ کا کیا طرز عمل ہے ڈاکٹر سید حسین نے

فرمایا کہ جنگ اور جنگ کے بعد کے زمانہ میں امریکی نقطۂ نظر بین الاقوامی تھا۔ پریسیڈنٹ ولسن ہی وہ پہلا شخص ہے جس نے مجلس اقوام کی داغ بیل ڈالی لیکن اس کے بعد امریکہ نے ادہر توجہ نہیں کی کیونکہ اس نے یہ محسوس کیا کہ جنگ میں شریک ہو کر اس نے غلطی کی۔ ثانیاً یہ امر بھی قابل ذکر ہے کہ جنگ کے بعد اکثر بڑی طاقتوں نے ممالک متحدہ کے قرضۂ جنگ کی ادائی کی جانب توجہ نہیں کی بلکہ گذشتہ چند سال میں اس قرض کا سود تک ادا نہیں کیا۔ لہٰذا اب امریکہ کسی بیرونی طاقت کا ساتھ دینے آمادہ نہیں ہے اور نہ وہ کسی بیرونی جنگ میں حصہ لیگا۔ البتہ اگر اس پر کوئی حملہ آور ہو تو وہ مدافعت ضرور کریگا۔

ہندوستان کی تاریخی عظمت

ڈاکٹر سید حسین نے ہندوستان کے حالات پر تبصرہ کرتے ہوئے فرمایا کہ اگر ہندوستان اپنی گذشتہ عظمت حاصل کرنا چاہتا ہے تو اس کے لئے محض سیاسی آزادی ہی حاصل کرنا کافی نہیں ہے۔ سیاسی آزادی تو بہر صورت حاصل ہو جائے گی اور ہونا بھی چاہیئے۔ لیکن ہندوستانی مرد اور عورتوں کو سب سے پہلے حقیقی ہندوستان کی از سر نو تلاش کرنی چاہیئے۔ اُس ہندوستان کی جس نے دنیا میں مذہب، فلسفہ اور تہذیب میں مشعل ہدایت روشن کی تھی۔ اگر ہندوستانیوں میں ذرا بھی روشن دماغی ہے تو انہیں سب سے پہلے یہ تسلیم کرنا چاہیئے کہ ہندوستانی جو کسی زمانہ میں عروج کے انتہائی نقطہ پر تھے آج انتہائی پستی کی حالت میں ہیں۔ اِس کے بعد انھیں فکر کرنا چاہیئے کہ گذشتہ عظمت کیسے حاصل کی جا سکتی ہے۔

یہ ایک امر واقعہ ہے کہ ابتدائے آفرینش سے تمدن کے ارتقاء میں تسلسل جاری ہے اور خیالات اور تہذیب میں باہمی تبادلہ ہوتا رہا ہے۔ مورخین نے یونان کو دنیا کا سب سے قدیم تمدن بتلایا ہے۔ لیکن اب یہ مسلمہ ہے کہ یونانیوں نے بھی مصری اور ایرانی تمدن سے اِکتساب کیا تھا۔ رومہ کی عالمی شہنشاہیت یونانی بنیادوں پر قائم ہوئی تھی۔ موجودہ مغربی تمدن اور رومہ کے تمدن کی شکست کے درمیان پورے ایک ہزار سال کی خلیج واقع ہے اور یہ وہ زمانہ تھا کہ یورپ اسلامی تمدن کے زیر اثر تھا۔ لیکن ان سب تمدنوں میں ہندوستان کے تمدن کو سب پر اولیت حاصل ہے۔ کیونکہ یہ سب سے قدیم ہے اور یہ دنیا کی تاریخ کی ایک حیرت ناک حقیقت ہے کہ وہ ابتک زندہ ہے اور اس میں آئندہ بھی زندہ رہنے کی طاقت ہے۔ یوں تو دنیا میں مصری، بیزنطانی، یونانی، رومی اور کارتھیج کے تمدن آئے اور فنا ہو گئے لیکن صرف ایک ہندوستانی تمدن ایسا ہے جو فنا کی گود میں پرورش پاکر بھی زندہ ہے اور ابھی تک اس کا سماجی، روحانی اور تہذیبی اثر باقی ہے۔ ہندوستانی تمدن کے متعلق لارڈ کرزن نے کہا تھا کہ نوع انسان کی تاریخ، مذہب اور فلسفہ پر دنیا کے دوسرے تمدنوں کے مقابلہ میں ہندوستان نے سب سے زیادہ گہرے اثرات چھوڑے ہیں اب ہندوستانی طلبا کو یہ معلوم کرنا چاہیئے کہ کیوں ہندوستان جو کسی زمانہ میں نور اور ہدایت کا سرچشمہ اور روحانی عظمت کا مسکن تھا آج اخلاقی پستی کے آخری درجہ پر ہے۔ ہندوستانیوں کے ہاتھ میں ایک شمع تک نہیں ہے کہ وہ جدید تمدنوں کو روشنی بتلا سکیں۔ اِس کی آخر کیا وجہ ہے؟

اس کے لئے طلبار کو سائنٹفک طریقوں سے یہ معلوم کرنا چاہیئے کہ تنزل کیوں واقع ہوا اور عظمت ماضی کے حصول کے کیا طریقے ہو سکتے ہیں۔ سوال یہ ہونا چاہیئے کہ آج ہندوستانی کیا کر رہے ہیں نہ یہ کہ ان کے اسلاف نے کیا کیا۔ اسلاف نے تو دنیا کو اپنا سب کچھ دیدیا —— مذہب، روحانیت اور فلسفہ جس پر ہندوستان کو آج بھی ناز ہے۔

مولوی سجّاد مرزا صاحب

مولوی سجاد مرزا صاحب ایم۔اے (کنٹب) عثمانیہ ٹریننگ کالج کے پرنسپل اور ملک کے مشہور تعلیمی رسالہ "المعلم" کے مدیر ہیں۔ آپ کا تعلیمی تجربہ بہت وسیع ہے اور آپ نے اُردو میں کئی تدریسی کتب کا اضافہ فرمایا ہے۔ آپ کا "اُردو کا قاعدہ" اُردو کا بہترین قاعدہ سمجھا جاتا ہے جس میں بچوں کی فطرت ان کے ذوق اور میلان طبع کو خاص طور پر ملحوظ رکھا گیا ہے۔

آپ کا قیام انگلستان میں ۱۸ء تا ۲۰ء رہا۔ آپ نے ۲۵ء میں جاپان کی اور ۳۰ء میں یورپ و ترکی کی سیاحت بھی فرمائی ہے۔

تعلیمی حالات

حصول علم کے لئے جو لوگ ہندوستان سے انگلستان جاتے ہیں اُنہیں سب سے زیادہ اس امر پر تعجب ہوتا ہے کہ وہاں کی بڑی بڑی جامعات اور مدارس کی حیثیت خانگی ہے اور اُن کے نظم و نسق اور اخراجات کو مرکزی حکومت سے کوئی تعلق نہیں ہوتا اُن کے سیاہ و سفید کے مالک ایسے اشخاص ہوتے ہیں جنھیں حکومت یا اس کی ملازمت سے کوئی دلچسپی نہیں ہوتی اور

حکومتی مداخلت کو روکنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ چنانچہ جنگ عظیم کے دوران میں جب آکسفورڈ اور کیمبرج کے اخراجات کی تنقیح کے لئے مرکزی حکومت نے کوشش کی تو اس کے خلاف سخت احتجاج کیا گیا۔ حقیقت میں قابل مبارکباد ہے وہ قوم جس نے حکومتی امداد کے بغیر برسوں سے اپنے نونہالوں کی تعلیم کا اتنا بہتر اور اعلیٰ انتظام کیا ہے اور اُن تعلیمی اداروں کے دروازے بلاتفریق مذہب و ملت دنیا کے ہر فرد کیلئے کھول دیئے ہیں۔

تربیت اطفال یورپ کی اقوام نے عرصہ دراز سے انسان کی مساوات کے اصول کو تسلیم کیا ہے اور وہاں ہر شخص کو ہر معاملہ میں یکساں موقع حاصل ہیں۔ اصول مساوات میں تقویت کے ساتھ ساتھ بچہ کی اہمیت بھی بڑھنے لگی اور ایک ایسا دور آگیا جب بچہ کی تعلیم و تربیت والدین کے ہاتھوں سے نکل کر حکومت کے ہاتھ میں آگئی۔ پانچ برس کی عمر سے تعلیم جبری اور مفت کردی گئی۔

یورپ کے کسی ملک میں بچوں کو نہ صرف کتابیں، کاپیاں، پنسل اور دستی مشاغل کے سامان مفت حکومت کی جانب سے دیئے جاتے ہیں بلکہ اُن کا علاج معالجہ بھی مفت کرایا جاتا ہے۔ اوقات مدرسہ میں اُنھیں موزون غذا کھلائی جاتی ہے جو نہ صرف صحت مند اور ارزان ہوتی ہے بلکہ والدین چاہیں بھی تو ایسا انتظام نہیں کر سکتے۔ ہر بچہ کو دن میں ایک مرتبہ پاؤ پاؤ بھر دودھ پلایا جاتا ہے۔ لندن میں دودھ اتنا سستا ہے کہ اس کی قیمت فی سیر ایک پنی یا دو آنہ ہے۔ یہ سب کچھ ایسے مادہ پرست ملک میں ہے جہاں گائے کی پرستش تو نہیں بلکہ اُس کی پرورش دودھ کی خاطر کی جاتی ہے۔

اِس میں شک نہیں کہ موثر تعلیمی نتائج کے لئے متذکرہ سہولتوں کے علاوہ موزوں عمارت، بازیگاہ، مناسب اور کافی فرنیچر اور آلاتِ تعلیمی کا ہونا ضروری ہے اور ان چیزوں کی طرف یورپ میں خاص توجہ صرف کی جاتی ہے۔ لیکن مولوی سجاد مرزا صاحب نے بعض ایسے بھی مدارس دیکھے ہیں جو ہماری طرح مشکلات میں گھرے ہوئے تھے۔ مگر اِس کے باوجود ان حالات پر قابو حاصل کیا گیا تھا کیونکہ جب اُصول پر پُورا پُورا اعتماد ہو تو ان کی تکمیل کے لئے کوئی نہ کوئی راستہ ضرور نکال لیا جا سکتا ہے۔ فعلیّت سے تجربہ اور تجربہ سے علم حاصل ہوتا ہے اور علم کے بعد غور و فکر کا مادہ پیدا ہوتا ہے۔

عورت کی زندگی

اِنگلستان کے ساحل پر قدم رکھتے ہی دوسری چیز جو جاذبِ نظر ہے وہ عورتوں کو آزادانہ چلتے پھرتے، کام کاج کرتے اور ہر صحبت میں شریک ہوتے دیکھکر ششدر رہ جانا ہے۔ جنگِ عظیم کے پہلے عورتوں نے مردوں کے مساوی حقوق تو حاصل کر لئے تھے لیکن یہ خیال عام تھا کہ عورتیں پھر بھی صنفِ نازک سے تعلق رکھتی ہیں اسلئے مردوں کو انکا پاس و لحاظ کرنا چاہیئے محنت طلب اور جوکھم کے کام مرد ہی کو انجام دینے چاہیں۔ لیکن جب گولی بارود کے بے ڈھرک استعمال سے ہزاروں نوجوانوں کی جانیں ضایع ہونے لگیں تو جنگ کے جاری رکھنے کے لئے ضرورت محسوس ہوئی کہ ایسے پیشے جو صرف مردوں کے لئے مخصوص تھے ان میں عورتوں کی بھرتی ہونی چاہیئے۔ چنانچہ جب رہے سہے ادھیڑ عمر کے مرد بھی میدانِ جنگ روانہ ہونے لگے تو اُن کی جگہ عورتوں کو لینی پڑی۔ سرکاری محکموں میں عورتیں بھر گئیں، عورتیں موٹر ران ہو گئیں، پولس میں داخل ہو گئیں اور سوائے میدانِ جنگ میں لڑائی لڑنے کے دوسرے ہر قسم کے فوجی کام کرنے لگیں

اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ معاشری حیثیت سے بھی عورتوں کو مردوں کے مساوی حقوق حاصل ہو گئے۔ اور اب یہ حالت ہے کہ اگر بھولے بسرے کوئی مردان کے صنف کے خیال سے پاس ولحاظ کرتا ہے تو وہ اس کو حقارت کی نظر سے دیکھتی ہیں اور اپنے لئے اِس قسم کا برتاؤ باعث ذلت تصور کرتی ہیں۔

عورت کا سماجی اور سیاسی حیثیت سے مرد کے مساوی اور ہم پلّہ ہونے کے بعد یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اُن کے اخلاق کس قسم کے ہونگے؟ شرم وحیاء جو عورت کا حقیقی زیور ہے اس کی کیا نوعیت ہوگی؟ ازدواجی تعلقات نے کیا صورت اختیار کی ہوگی؟ اکثر لوگوں کو یہ سُن کر غالباً تعجب ہوگا کہ انگلستان میں دوسرے ممالک کی طرح کوئی عورت اپنے حسن وجمال کو ذریعۂ آمدنی نہیں بنا سکتی۔ انگلستان کا قانون اِس قسم کے "پیشہ" کو قطعاً ممنوع قرار دیتا ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ وہاں نہ صرف عورتوں کے لئے بلکہ مردوں کے لئے بھی اخلاق کا معیار بہت بلند ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ معاشی کشمکش ہر جگہ بالخصوص عورت کی اخلاقی خرابی کا باعث ثابت ہوئی ہے اور مصلحان مغرب نے جب اس نکتہ کو سمجھا تو اُنہوں نے معاشی حالت کی درستی کو مضبوط ترین ذریعہ اصلاح اور استحکام اخلاق گردانا۔ بادی النظر میں یہ خیال ہوتا ہے کہ عورت کی آزادی مخرب اخلاق ہوتی ہے لیکن غور سے دیکھا جائے تو خود آزادی بڑی ذمہ داریاں عائد کرتی ہے اور اِنگلستان کی عورت جتنی آزاد ہے اتنی ہی وہ اپنی عفت وعصمت کی زبردست پاسبان بھی ہے۔ جنگ عظیم میں جس طرح یورپ کی قوموں نے اپنا خون بہایا عورتوں نے سخت ترین مصائب جھیلے اور زبردست مشکلات کا مقابلہ کیا اس سے ثابت

ہوتا ہے کہ ان کے اخلاق کا معیار کتنا بلند ہے جس سے ہر شخص سبق حاصل کر سکتا ہے

حریت و مساوات کی بدولت ازدواجی زندگی بھی خوشگوار ہوتی ہے کیونکہ ایسے ہی لوگ شریک زندگی بنتے ہیں جو ایک دوسرے سے واقف اور اپنے اخراجات کے کفیل ہوتے ہیں۔ دونوں اپنی ذمہ داریوں کو خوب سمجھتے ہیں اور اپنی اولاد کو اپنے سے زیادہ بہتر زندگی بسر کرنے کے لئے تیار کرتے ہیں۔ چنانچہ نسلاً بعد نسلٍ، تمول، تہذیب اور شائستگی میں ترقی کا سلسلہ برابر قائم رہتا ہے۔

ہمارے ملک میں عام طور پر یورپ کی حریت پسند عورتوں کے متعلق بڑی غلط فہمی پھیلی ہوئی ہے۔ ہمارے ملک کی فضاء ایسی ہے کہ یورپ کی عورتوں کے بجائے اگر ترکی یا عراق کی عورتوں کے حالات کا تذکرہ کیا جائے تو شاید یہ چیز اہل ملک کے جمود میں کچھ حرکت کا باعث ثابت ہو۔ کسی اسلامی ملک کا کونہ کونہ چھاننے پر بھی وہ "پردہ" نظر نہیں آئیگا جو ہندوستان میں عورتوں کی زندگی کا جزو اعظم بنا دیا گیا ہے۔ ترکی میں حرم سرا کی زندگی نے عورتوں کے عادات و اخلاق خراب کر دئیے تھے، ان کے قویٰ کمزور ہو گئے تھے، اُن میں مختلف امراض مثلاً تپ، دق، سِل پیدا ہو گئے تھے، ان میں ذہنی اِنحطاط پیدا ہو گیا تھا اور خود داری مفقود ہو گئی تھی۔ اُن کے دل میں یہ بات بیٹھ گئی تھی کہ عورت کا ذریعہ معاش صرف ایک ہی ہے یعنی اپنی صنف کا اِستعمال۔ ظاہر ہے اِن حالات اور ایسے تاریک ماحول میں کس قسم کے بچے پیدا ہوں گے اور اُن کی نشو ونما کا نازک زمانہ کس فضاء میں بسر ہو گا۔ یہی وہ اسباب ہیں کہ ترکی کے محبانِ قوم نے حرم سرا کی مصنوعی زندگی کو یک لخت مسمار کر دیا اور ترک عورت کو صدیوں کی غلامی و بیچارگی سے

نجات دلائی۔

ہندوستان کے یاس انگیز حالات کے متعلق مولوی سجاد مرزا صاحب کے دماغ میں جو سوالات پیدا ہوئے وہ یہ ہیں کہ کیا نحیف مریض اور غمگین عورت کا بچّہ تنومند، صحت ور اور خوش مزاج ہو سکتا؟ کیا تنگ خیال عورت کا بچّہ روشن خیال اور کیا مقید عورت کا بچّہ آزاد ہو سکتا ہے؟

مولوی قادر حسین خان صاحب

مولوی قادر حسین خاں صاحب یم، اے، بیرسٹرایٹ لا نظام کالج کے پرنسپل اور جامعہ مدراس کے سینٹ، اکاڈمک کونسل اور سنڈیکیٹ کے رکن ہیں۔ آپ سررشتہ معلومات عامہ سرکار عالی کے سنہ ۳۱ تا سنہ ۳۴ء ناظم رہ چکے ہیں۔ معاشیات و نظم عامہ آپ کے خاص مضامین ہیں جن پر آپ نے جامعہ اکسفورڈ، لندن اور پیرس میں تحقیقات بھی فرمائی ہیں۔

انگلستان میں آپ کا قیام سنہ ۲۰ تا سنہ ۲۸ء رہا۔

یورپ کی تقلید یوربین اقوام کی زندگی کی تقلید کرنے کی ہمیں مطلق ضرورت نہیں ہے۔ یورپ نے بہت سی چیزیں ہم سے سیکھی ہیں۔ ہم ان چیزوں کو بھلا بیٹھے ہیں اور ہم پر ادبار کی گھٹا چھائی ہے۔ یورپ ان پر عمل پیرا ہے اور بام ترقی پر ہے۔

قرون وسطی تک یورپ پر جہالت کی تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ اس ظلمت میں مسلمانوں نے شمع ہدایت روشن کی اور اپنے زندۂ جاوید کارناموں سے یورپ کے

تن مُردہ میں بیداری کی روح پھونکی۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ مسلمان اپنی ترقی کے اَوج پر تھے جہاں آج بھی یورپ اخلاقی نقطہ نظر سے باوجود اتنی تہذیب وتمدن کے اس معیار کو نہیں پہنچا ہے۔

نظرغائر سے دیکھنے والوں کو اسلامی اور یورپین تہذیب میں ایک بڑا فرق محسوس ہوگا۔ وہ یہ کہ آخرالذکر کی بنیاد عیسائیت پر قائم ہے۔ ایسی عیسائیت پر جس کے خدا کے تصور کو عقل انسانی تسلیم نہیں کر سکتی۔ جہاں انسانی اعمال کی کوئی حقیقت نہیں اور جہاں گناہ کا تصور انسانی کفارہ پر رکھا گیا ہے۔ یہی وہ تہذیب ہے جس سے ہم درس بصیرت حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ اسلام کی بنیادیں ایسی کھوکلی نہیں ہیں۔ یہاں ہر چیز فطرت انسانی کے مطابق ہے۔ علاوہ ازیں یورپ کی ترقی نتیجہ ہے صدیوں کی مسلسل سعی وکاوش کا۔ مسلمانوں نے صرف تین سو سال کے قلیل عرصہ میں اتنی ترقی کی تھی کہ یورپ ابھی صدیوں تک یہ بات پیدا نہیں کر سکتا۔

اسلامی اصول

آج بھی اسلامی اصول یورپ کے لئے سرمایۂ بصیرت ہیں۔ یورپ میں گداگری قانوناً ممنوع ہے لیکن افلاس زدہ لوگوں کی تعداد میں کمی نہیں ہوئی۔ کیا ہماری زکوٰۃ کے بعد معاشرہ کا ایک بھی شخص محتاج رہ سکتا ہے؟ یورپ میں قانوناً صرف ایک عورت سے شادی کی جا سکتی ہے لیکن بداخلاقی عام ہے۔ عورتوں کی بے راہ روی اور حیاسوز آزادی، ناجائز اولاد کی کثرت اور طلاق کی زیادتی اس قانون کے اٹل ہونے کے نتائج ہیں۔ اسلام نے خاص حالات میں ایک سے زیادہ بیویوں کی اجازت دی ہے اور اس قانون کی مصلحت اور عمدگی کا اندازہ یورپ کے حالات دیکھکر ہی کیا جا سکتا ہے۔ اِسیطرح شراب خواری

اور جوے بازی کی کثرت کیوجہ سے یورپین سوسائٹی میں بہت سی خرابیاں پیدا ہوگئی ہیں جو فوری اصلاح کی محتاج ہیں۔ اسلامی قانون وراثت یورپ کے قوانین وراثت سے بہتر اور اعلیٰ ہیں۔ یہ نہیں کہ انگلستان کی طرح صرف فرزند اکبر ہی ساری جائداد کا مالک بن بیٹھا اور دوسرے ہوا پر اڑ گئے۔ اسلام میں ہر شخص اپنے پاؤں پر کھڑا کر دیا جاتا ہے۔ دولت کی تقسیم اور سیال پذیری جتنی اسلام میں ہے وہ کہیں نظر نہیں آتی۔ حقیقت یہ ہے کہ اشتراکیت کے بہترین اصول اسلام میں موجود ہیں۔

یورپ کی معاشی ترقی کی بنیاد سود خواری پر ہے جس کی وجہ سے سوسائٹی میں ایک ایسے مفت خور طبقہ کا اضافہ ہوگیا ہے جو اپنا بیکار پیسہ کفالتوں اور دیگر سودی کاروبار میں لگا کر محض دولت بٹور رہا ہے یہی وجہ ہے کہ وہاں سرمایہ اور محنت میں سخت کشمکش جاری ہے جس سے پوری سوسائٹی متاثر ہے۔ ان دونوں طبقوں میں جو خلیج حائل ہے اس کو عبور کرنے کے لئے آئے دن تجاویز پیش ہوتی رہتی ہیں لیکن کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوتا کیونکہ جب تک ملک میں ایک طبقہ مالدار اور اس کے مقابلہ میں دوسرا مفلس موجود ہے تو دونوں میں آویزش کا پیدا ہونا لازمی ہے۔ اس کے برخلاف اسلامی اصول اور قوانین ایسے ہیں کہ ان سے افراد میں معاشی کشمکش کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ کیونکہ اس کشمکش کی جو بنیاد ہے یعنی سود اس کو اسلام نے حرام قرار دیا ہے۔ اسیطرح منافع کمانے کے لئے بھی اسلام نے طریقے بتلائے ہیں۔ قحط سالی کے زمانہ میں اجناس کا جمع کر لینا تاکہ زیادہ سے زیادہ منافع حاصل کیا جائے ہمارے پاس جائز نہیں ہے۔

خاتمہ: یورپ کی ترقی اگر محنت اور تنظیم کا نتیجہ ہے تو کیا اسلام نے محنت کی

تلقین نہیں کی ہے اور کیا مسلمانوں میں تنظیم نہیں تھی۔ ان کی تنظیم اور ضبط ہی نے انہیں ایک قلیل مدت میں دنیا کے فاتحین کی صف اول میں لا کھڑا کر دیا تھا۔ یورپ میں کوئی شخص محنت سے جی نہیں چراتا اور کوئی پیشہ اس کی نظروں میں ذلیل نہیں ہے۔ لیکن ہمارے لئے سرکاری ملازمت معراج ہے۔ ہم نے محنت کو عیب سمجھ رکھا ہے۔ ہم نے ساری چیزیں قسمت پر چھوڑ دی ہیں جس کا خمیازہ بھی ہم بھگت رہے ہیں۔

مختصر یہ کہ یورپ کی کونسی ایسی چیز ہے جو ہم میں موجود نہیں ہے یا جو ہم نہیں کر سکتے ہیں۔ صرف جوش، خلوص اور سلیقہ کی ضرورت ہے۔ کیا آنحضرت صلعم کے اسوۂ حسنہ میں ہمیں وہ سب حاصل نہیں ہو جاتا جس سے انسانیت کی تکمیل ہوتی ہے۔

پروفیسر حسین علی مرزا

پروفیسر حسین علی مرزا بیرسٹرایٹ لا جامعہ عثمانیہ کے شعبہ قانون کے صدر ہیں۔ آپ کو اصول تعلیم سے بیحد دلچسپی ہے اور انگلستان کے حالات کا آپنے غائر نظر سے مطالعہ کیا ہے۔ قانون بین الاقوام اور تاریخ دستوری آپ کے خاص مضامین ہیں "وفاق اور حکومت ہند" پر آپ نے انگریزی زبان میں ایک کتاب بھی تحریر فرمائی ہے جو زیر طبع ہے۔

آپ کا قیام انگلستان میں ۲۰ء تا ۲۴ء رہا۔

تعلیم انگلستان میں اعلیٰ تعلیمی ادارات زیادہ تر خانگی جد وجہد کا نتیجہ ہیں۔ زمانہ قدیم میں جامعات اور کالجوں کا قیام مذہبی اوقاف کے ذریعہ ہوتا تھا۔ آکسفورڈ اور کیمبرج کی بنا اسیطرح ہوئی۔ لیکن انگلستان میں ابتدائی جبری تعلیم کا آغاز ۱۸۷۰ء کے بعد سے ہوا جبکہ جرمنی میں سماجی قانون سازی کی تحریک زوروں پر تھی۔ لیکن اس کے باوجود انگلستان میں تعلیم کی توسیع واشاعت کا یہ عالم ہے کہ اپنے چار سال کے قیام میں پروفیسر حسین علی مرزا کو انگلستان میں صرف

ایک شخص ایسا ملا جواَن پڑھ تھا اور جس کی وجہ اس نے اپنا مفلوج ہونا بیان کیا۔

انگلستان میں پبلک اسکول کا طریقہ بھی بہت ہی قدامت سے چلا آرہا ہے لیکن ان جملہ قدیم ادارات کی خصوصیت یہ ہے کہ یہاں تعلیم ایک خاص اصول اور نصاب کے تحت دیجاتی ہے جو بیسویں صدی کی عملی زندگی کی ضروریات کیلئے ناکافی ہے اور اس کمی کو نئی جامعات اور ادارات کے قیام کے ذریعہ پورا کیا جارہا ہے چنانچہ لندن میں برناڈ شا، سڈنی وب اور گراہام والس کی کوششوں سے ایک مدرسہ معاشیات قائم کیا گیا جہاں نہ صرف اجرت تعلیم ہی کم رکھی گئی ہے بلکہ پڑھائی کے اوقات بھی صبح وشام ایسے رکھے گئے ہیں کہ ہر شخص اپنی سہولت اور فرصت کے لحاظ سے استفادہ کرسکتا ہے۔ آج اس مدرسہ معاشیات نے ایک بین الاقوامی اہمیت حاصل کرلی ہے اور ہر شعبہ علم کی ڈگری جو بہت ہی مستند تسلیم کی جاتی ہے یہاں سے حاصل کی جاسکتی ہے۔ یورپ کے جملہ ممالک کے طلبا یہاں جمع ہوتے ہیں اور یہاں کے اساتذہ بین الاقوامی شہرت کے مالک ہیں جیسے گراہم والس آنجہانی، لی سمتھ یم پی، پروفیسر لاسکی، ڈاکٹر گریگری، ڈاکٹر ولف وغیرہ۔

اس ادارے کی طرح لندن میں ایک اور ادارہ حرفت (politich Nique) ہے جہاں پر ہر قسم کی پیشہ ورانہ تعلیم کا انتظام ہے اور درس کے اوقات بھی صبح وشام کے ہیں۔

تعلیم یافتہ بیروزگاری میرے اس سوال پر کہ ملک میں تعلیم اتنی عام ہونے کے باوجود وہاں تعلیم یافتہ بے روزگاری کا سوال کیوں نہیں پیدا ہوتا آپ نے فرمایا کہ اپنے چار سال کے قیام میں آپ کو ایک بھی طیلسانی

ایسا نہیں ملا جو بے روزگار ہو۔ البتہ جسمانی محنت کرنے والوں میں بے روزگاری شدت سے پائی جاتی ہے جو نہ صرف انگلستان تک محدود ہے بلکہ یورپ کے ہر صنعتی ملک کا یہی حال ہے۔ یورپ میں بے روزگاری کے اسباب بین الاقوامی ہیں اور اُس کا تعلق دنیا کی تجارت سے ہے۔ لیکن تعلیم یافتہ بے روزگاری کے نہونے کی یہ وجہ ہے کہ بچوں کی تعلیم شروع ہونے کے قبل ہی سے والدین کو حکومتی اور خانگی اداروں کے ذریعہ یہ معلومات آسانی سے مہیا ہوتے رہتے ہیں کہ کس قسم کے افراد کی کھپت کس قسم کے پیشوں میں ہے یا ہونے والی ہے اور اسی لحاظ سے بچوں کو تعلیم دلائی جاتی ہے اور اس معاملہ میں بچوں کے ذہنی رجحانات کو خاص طور پر ملحوظ رکھا جاتا ہے یہی وجہ ہے کہ بہت کم طلبا، فنون کی ڈگریوں کی طرف توجہ کرتے ہیں۔ اور جو ادہر آجاتے ہیں ان کے لئے پوری سلطنتِ برطانیہ کے دروازے کھلے ہوئے ہیں۔ لیکن آجکل چونکہ شہنشاہی علاقوں میں بھی قومی جذبات ترقی پذیر ہیں لہذا انگلستان میں تعلیم یافتہ بے روزگاروں کی تعداد بھی آہستہ آہستہ بڑھ رہی ہے۔

نقائص یورپی طرز تعلیم کے متعلق اُوپر جو کچھ کہا گیا ہے اس سے بادی النظر میں یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ وہاں کے تعلیمی حالات شاید بہترین ہیں اور ان میں اَب مزید ترقی کی گنجائش نہیں ہے۔ اور اس سے لازماً یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا تمام ایشیائی ممالک کو تعلیمی معاملات میں یورپ کی اتباع کرنی چاہئیے۔ اگر نظر غائر سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ یورپ کے نظام تعلیم میں بعض بنیادی نقائص بھی پائے جاتے ہیں۔ اُنیسویں صدی سے یورپ کا رجحان ہر شئے میں پیدائش بر پیمانۂ کبیر کی جانب رہا ہے جس کا اثر غیر شعوری طور پر تعلیمی ادارات پر بھی

پڑا جہاں سے فیکڑیوں یا کارخانوں کی کسی پیداوار کی طرح طلباء ایک مقررہ معیار کے بموجب جس کو عام اصطلاح میں "امتحان" کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے بڑی تعداد میں نکلنے لگے۔ اس میں شک نہیں کہ آجکل طلباء کی انفرادی خصوصیات کو اجاگر کرنے کے لیئے بہت سے نئے تجربات کئے جارہے ہیں خاصکر تحتانی تعلیم میں لیکن اس کے باوجود عام رجحان پیدائش بر پیمانۂ کبیر ہی کی جانب ہے۔ یہ ایک بڑا نقص ہے۔

دوسری خرابی یہ ہے کہ تعلیمی نصاب اور ماحول کچھ اس قسم کا ہے کہ بین الاقوامی مطمح نظر کے مقابلہ میں قومی نقطۂ نظر پر زیادہ توجہ صرف کی جاتی ہے جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اقوام عالم میں باہمی کشمکش اور منافرت کے جذبات پرورش پاتے ہیں اور جنگ کے لیئے میدان صاف ہوتا ہے۔ بظاہر جنگ کے اسباب معاشی ہوا کرتے ہیں لیکن آجکل اس کا اصلی سبب یہ ہے کہ اقوام کو آپسمیں ایک دوسرے سے نفرت ہے اور ہر قوم اپنے آپ کو ہر معاملہ میں دوسرے کے مقابلہ میں برتر و بالا سمجھنے پر مجبور ہو گئی ہے۔ چنانچہ ان ہی خیالات کے پیش نظر تعلیمی نصاب بھی مرتب ہوتا ہے اور ابتداہی سے بچوں کے دلوں میں قوم پرورانہ خیالات جاگزیں کئے جاتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ یورپ اور سارے عالم کا امن برقرار نہیں رہ سکتا۔ لہذا افسوس کے ساتھ اس امر کا اظہار کیا جاتا ہے کہ یورپی طریقہ تعلیم نے دنیا میں ممکن ہے اچھے سائنس داں، صناع اور سپاہی پیدا کئے ہوں لیکن امن پسند شہریوں کے پیدا کرنے میں یہ نمایاں طور پر ناکام ثابت ہوا۔ بعض وقت یہ کہا جاتا ہے کہ بعض قومی اور سیاسی لیڈروں کی وجہ سے عوام جنگ میں شریک

ہوتے ہیں۔ یہ صحیح نہیں ہے۔ کیونکہ جب تک کسی قوم کے مزاج میں یہ رجحان نہ پیدا ہو جائے کہ اسے کسی دوسری قوم کے مقابلہ میں صف آرا ہونا ہے اس وقت تک ان پر کسی لیڈر کا اثر قائم نہیں ہو سکتا۔

اس بین الاقوامی مصیبت اور کشمکش کا اگر کوئی حل ہو سکتا ہے تو وہ ایک ہی ہے یعنی یہ کہ امن عالم کے قیام کے لئے یورپ اپنے تعلیمی نظام کی بنیادی نقطہ نظر سے نظر ثانی کرے کیونکہ قومی نقطہ نظر سے تعلیم دلانا اور بین الاقوامی امن کی توقع رکھنا دو متضاد سی چیزیں ہیں۔ یہ کام بجز مجلس اقوام کے تنہا کسی قوم سے ممکن نہیں ہے۔ بعض وقت یہ بھی خیال کیا جاتا ہے کہ چونکہ فی زمانہ عورتوں کو پہلے کے مقابلہ میں حقوق نمائندگی حاصل ہیں اور وہ سیاسی، سماجی اور معاشی حیثیت سے مرد کے دوش بدوش ہیں اس لئے امن عالم کے قیام میں ان سے بڑی مدد ملیگی۔ لیکن یہ خیال صحیح نہیں ہے کیونکہ عورتیں بھی آخر اسی نظام تعلیم کی پیداوار ہیں جو مردوں کے لئے مقرر ہے۔ ایچ۔ جی ولس کے قول کے مطابق آجکل لوگوں نے قومیت کو اپنا قومی خدا بنا لیا ہے جو بین الاقوامیت کا دشمن ہے اور جب تک یہ دشمنی باقی ہے امن عالم خطرہ میں ہے۔

ذاتی خصوصیات۔ یورپ کے ہر خود مختار ملک میں حب الوطنی کا جذبہ یکساں طور پر پایا جاتا ہے اور اگر قومی احساس اور ایثار کا مادہ کہیں زیادہ ہے تو انگلستان میں ہے۔ برخلاف اس کے ہمدردی اور حریت کے جذبات فرانس میں بڑھے ہوئے ہیں۔ جتنی باقاعدگی انگلستان میں ہے اتنی فرانس یا یورپ کے کسی ملک میں نہیں ہے۔ البتہ عام اخلاق فرانس میں زیادہ خوشگوار نظر آتے ہیں

انگریز نہ صرف ہندوستانیوں سے دور اور علیحدہ رہنے کی کوشش کرتے ہیں بلکہ اہل یورپ سے بھی انھیں خاصی اجنبیت ہے جس کی وجہ ان کے جغرافی حالات ہیں۔ اور یورپ کے جملہ شمالی ممالک کا یہی حال ہے۔ برخلاف اس کے جنوبی یا لاطینی ممالک میں پردیسیوں سے اتنی اجنبیت نہیں پائی جاتی ہے۔

انگلستان میں جبری فوجی خدمت کا طریقہ رائج نہیں ہے لیکن جب ملک پر کوئی آفت آن پڑتی ہے تو ہر شخص اپنی جان و مال کی قربانی کے لئے تیار ہو جاتا ہے۔ یہی جذبۂ ایثار دراصل انگلستان کی ترقی کا راز ہے۔ ایک معمولی انگریز بھی ذاتی مفاد کے مقابلہ میں قومی مفاد کو ترجیح دیگا خواہ اُس میں اُسے کتنا ہی نقصان کیوں نہ برداشت کرنا پڑے۔

انگلستان کی ہر جامعہ میں خانگی اشخاص کی جانب سے کثیر چندے جمع ہوتے ہیں تاکہ کسی خاص علم یا فن کی "کرسی" قائم کی جائے۔ قوم پرستی کا یہ عالم ہے کہ تعلیمی اور رفاہی کاموں میں حکومت سے زیادہ خانگی اشخاص کو دلچسپی ہے اور اکثر ادارے کلیتہً خانگی سرمایہ سے چلائے جاتے ہیں۔

معیار زندگی

یوں تو اہل یورپ کا معیار زندگی ہم لوگوں کے مقابلہ میں بہت بلند ہے لیکن اس معاملہ میں خود یورپ کے ممالک میں امتیاز کرنے کی ضرورت ہے۔ مثلاً انگلستان کا معیار زندگی اطالیہ سے بہت بلند ہے۔ جہاں معیار زندگی بلند ہو تو لازماً ہر شخص کا میلان خود مختارانہ زندگی کی طرف ہوگا چنانچہ انگلستان کی لڑکیاں بھی یہ گوارا نہیں کرتیں کہ چودہ پندرہ سال کی عمر کے بعد اُن کے خورونوش کا بار والدین پر پڑے۔ لیکن جہاں یہ انفرادیت جذبۂ خود مختاری

نشو و نما کے لئے معاون ثابت ہوتی ہے وہاں اخلاق پر بھی اس کا بڑا اثر پڑتا ہے۔ مشرقی نقطۂ نظر سے یہ چیز عجیب معلوم ہوتی ہے کہ یورپ میں اگر بیٹا ضرورتاً باپ سے ایک ڈاک کا ٹکٹ بھی لیتا ہے تو اس کی نیت اس کو واپس کرنے کی ہوتی ہے یا وہ اس کی قیمت ادا کر دیتا ہے۔ ایک خاص عمر کو پہنچنے کے بعد بچے اپنے کھانے پینے کا خرچ والدین کو پابندی سے ادا کرتے ہیں اور گھر ان کے لئے ہوٹل بن جاتا ہے۔ یہ نتیجہ ہے ملک کی صنعتی ترقی کا۔ اس سے خاندان کا قدیم تصور کمزور پڑ جاتا ہے اور انفرادیت کا جذبہ ترقی کرتا ہے۔ جہاں انفرادیت کا جذبہ اتنا ترقی یافتہ ہو اور ہر شخص خود مختار رہے وہاں قومی تصورات بھی عجیب و غریب ہوتے ہیں۔ اپنوں سے بیگانگی ایک حد تک جائز سمجھی جاتی ہے لیکن قومی معاملات میں جذبۂ ایثار دیوانگی کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔

انگلستان میں حکومت اور رعایا میں قدیم زمانہ کی طرح کسی قسم کی کشمکش نہیں پائی جاتی۔ یہ غالباً برطانوی دستور کی خوبی کی وجہ ہے۔ حکومت میں بظاہر دو جماعتیں ہیں۔ ایک حکومتی اور دوسری مخالف جماعت اور یہ دونوں اپنے اپنے نقطۂ نظر میں ایک دوسرے کی مخالف ہیں۔ لیکن جب قوم کا معاملہ درپیش ہوتا ہے تو لوگ تمام تفرقے بھول جاتے ہیں اور ملک میں ایک جماعت قائم ہو جاتی ہے۔ چنانچہ جنگ کے زمانہ میں اور حالیہ قومی حکومت کے وقت ایسا ہی ہوا۔ جب کوئی خاص قومی اہمیت کا معاملہ درپیش ہوتا ہے تو دونوں جماعتوں میں سمجھوتہ ہو جاتا ہے اور کوشش کی جاتی ہے کہ ایسے اُمور کو جماعتی سیاسیات سے بالاتر رکھا جائے۔

عورت میرے اس سوال پر کہ یورپ کی عورتوں کی ترقی اور آزادی کی ہماری

عورتیں کہاں تک اتباع کرسکتی ہیں پروفیسر حسین علی مرزا نے فرمایا کہ اس سوال کا جواب دینے کے قبل تمہید کے طور پر بعض چیزوں کا بیان کرنا ضروری ہے۔ ہمارے پاس عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ یورپ کی عورتوں کی اخلاقی حالت بہت گری ہوئی ہے اور ہم میں بعض ایسے بھی لوگ ہیں جو وہاں کی عورتوں کو بہت ہی ترقی یافتہ سمجھتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ ہندوستانی عورتیں ان کی تقلید کریں۔ آپ نے ان دونوں خیالات کی مخالفت کی اور فرمایا کہ اس کی وجہ بظاہر یہ معلوم ہوتی ہے کہ ہندوستان میں اخلاق کے جانچنے کے لئے دو معیار ہیں۔ مردوں کے لئے ایک اور عورتوں کے لئے ایک ایک مثال کے ذریعہ اس کی یوں توضیح ہوسکتی ہے۔ اگر کوئی ہندوستانی مرد شراب خوار یا آوارہ ہو تو سوسائٹی اس کو اتنا بُرا نہیں سمجھتی۔ اس کے برعکس کسی ہندوستانی شریف گھرانے کی لڑکی اگر اپنی عمر میں ایک مرتبہ بھی شراب پی لے یا اتفاقی طور پر اس سے کوئی لغزش ہوجائے تو سوسائٹی کے نزدیک وہ بدترین گناہ کی مرتکب قرار پاتی ہے اور معاشرہ میں اُس کے لئے کوئی جائے پناہ نہیں۔ یورپ میں عورتوں اور مردوں کے لئے ایک ہی معیار ہے خواہ وہ ان کی برائیوں سے متعلق ہو یا اچھائیوں سے۔ اگر شراب خواری یا آوارگی مردوں کے لئے جائز تصور کیجا سکتی ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ عورتوں کے لئے یہ ناجائز قرار دیجائے۔

یورپ کے اخلاقی حالات پر رائے قائم کرتے وقت ہم سے ایک اور غلطی ہوتی ہے۔ وہ یہ کہ ہم غیر شعوری طور پر ہندوستان کے متوسط یا اعلیٰ متوسط طبقہ کے اخلاق کا مقابلہ عمومیت سے یورپ کے کام کرنے والے ادنیٰ طبقے کے لوگوں کے اخلاق سے کرتے ہیں۔ ہم اُن کی برائیوں اور کمزوریوں کو دیکھکر اپنے اعلیٰ اخلاق اور کردار پر

دل ہی دل میں خوش ہوتے ہیں۔ اور یہ بھول جاتے ہیں کہ ہمارا یہ مقابلہ بنیادی طور پر غلط ہے کیونکہ ہم صرف اپنے ایک طبقہ کا وہاں کی جملہ آبادی سے مقابلہ کر رہے ہیں۔ دونوں کے مقابلہ کا سائنٹفک طریقہ یہ ہے کہ ہندوستان کی پوری آبادی کے محاسن و معائب کو ترازو کے ایک پلڑے میں اور یورپ کے محاسن و معائب کو دوسرے پلڑے میں رکھکر دیکھا جائے تو فطرت انسانی دونوں جگہ ایک ہی نکلیگی۔ آپ کی رائے میں سوال یہ نہیں ہے کہ سیاہ یا زرد لوگوں کی اخلاقی حالت اچھی ہوتی ہے اور سفید لوگوں کی خراب بلکہ اصل سوال دولت اور عسرت کا ہے۔ اگر اس چیز کو ایک عام مفہوم میں ادا کیا جائے تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ انتہائی عسرت اور انتہائی دولت سے بداخلاقی پیدا ہوتی ہے۔ کیونکہ ایک صورت میں عیش و عشرت کی فراوانی ہوتی ہے اور دوسری میں ضرورت کی مجبوری۔ گویا صرف متوسط طبقے ہی میں اخلاق کا ایک اعلیٰ معیار قائم رہ سکتا ہے۔

ہم لوگ دراصل معاشری و معاشی ماحول کا نتیجہ ہیں اور ہمارے اخلاق کا بھی نسل اور رنگ کے بجائے ان ہی حالات پر دارومدار ہے۔ پروفیسر حسین علی مرزا کا خیال ہے کہ جماعتوں میں لڑکا اور لڑکیوں کے آپس کے میل جول سے ان میں جنسی ترغیبات کا سدباب ہو جاتا ہے اور جہاں ہم تعلیمی طریقہ کا رواج نہیں ہے، وہاں یہ بات حاصل نہیں ہو سکتی۔ آپ نے فرمایا کہ کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ ہندوؤں یا عیسائیوں کے مقابلہ میں مسلمانوں میں جذبات شہوانی زیادہ ہیں جس کی وجہ بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ ہم گوشت خوار ہیں حالانکہ اہل یورپ ہم سے زیادہ گوشت کے عادی ہیں۔ یہاں مسلمانوں سے مراد عامتہ الناس اور وہ لوگ ہیں جن پر مذہب اور

اسلامی تہذیب کا کوئی خاص اثر نہیں اور جو تہذیب جدید کی تقلید میں اندھے ہو گئے ہیں۔ ہمارے مدارس اور تعلیمی ادارات میں مسلمان طلبا، جتنی غلط کاریوں کا شکار ہوتے ہیں اتنے دیگر اقوام کے طلباء نہیں ہوتے۔ اس کی وجہ بظاہر اس کے سوا کچھ نہیں معلوم ہوتی کہ ہمارے تمدن میں عورت اور مرد کے میل جول کے مواقع نہیں ہیں۔ جس نظر سے ہم اپنے گھر کی عورتوں کو دیکھتے ہیں اسی نظر سے باہر کی عورتوں کو نہیں دیکھتے۔ عورت ہمارے لئے ایک معمّہ ہے۔ عورت کے متعلق مسلم نوجوانوں میں جتنا تجسس پایا جاتا ہے اتنا دیگر اقوام کے نوجوانوں میں نہیں پایا جاتا کیونکہ انہیں اپنے گھر کی عورتوں کے سوا غیر عورتوں سے گھُل ملنے کے مواقع حاصل ہیں جن سے بڑی حد تک جنسی ترغیبات پر قابو حاصل ہو جاتا ہے۔ بہر کیف یہ مسئلہ ایسا ہے جس پر مصلحان قوم کو سنجیدگی سے غور کرنا چاہیئے۔

یورپ کی تقلید

پروفیسر حسین علی مرزا کا خیال ہے کہ ہماری عورتوں کے لئے یورپین عورتوں کی تقلید مہلک ثابت ہوگی۔ اس کے ہرگز یہ معنی نہیں کہ ہم قدامت پرست رہیں۔ معاشی اور سائنٹفک ترقیات اور اصلاحات کی حد تک ہمیں یورپ کی پیروی کرنی ضروری ہے لیکن ہمیں کسی ایسی تقلید کی ضرورت نہیں جس سے ہماری تہذیب و تمدن اور قومی خصوصیات کو نقصان پہنچے۔

ہماری تہذیب و تمدن کی اصلی خصوصیات کو قائم رہنا چاہیئے۔ ترکی کی ترقی کا یہی راز ہے۔ اسلحہ جنگ اور دیگر قومی ضروریات کی حد تک ترک یورپ کی ترقی یافتہ قوموں کی صف میں ہیں مگر ترکی تہذیب کا دامن اُنہوں نے اپنے ہاتھ سے نہیں چھوڑا اور خانگی زندگی میں یورپ کی غلط پیروی نہیں کی۔ زمانہ کا ساتھ دینے

اور اپنی قومی وحدت اور وقار کو قائم رکھنے کے لئے جن چیزوں کی ضرورت ہے ہم کو ان کے حاصل کرنے میں کوئی کسر نہ اُٹھا رکھنی چاہیئے مثلاً، موٹر، ہوائی جہاز، مشین گن، وائرلس، ریڈیو وغیرہ ایسی چیزیں ہیں کہ ان کے بغیر آجکل کسی قوم کا زندہ رہنا مشکل ہے۔ لیکن خانگی زندگی میں یورپ کی تقلید کرنا اپنی تہذیب کا گلا گھوٹنا ہے۔ کیا میز کرسی اور کانٹے چھری کے استعمال ہی سے ہم ترقی یافتہ کہلائینگے اور بغیر اس کے نہیں۔ بعض لوگوں کے بچوں کی زبان پر "اماں" اور "ابا" کے بجائے "مما" اور "پپا" کے الفاظ ہیں۔ جب ہماری زبان میں پہلے ہی سے الفاظ موجود ہوں تو دوسری زبان کے الفاظ کے اختیار کرنے کے کیا معنی ہیں۔ اس سلسلہ میں آپ نے ایک یورپ زدہ حیدر آبادی صاحب کا واقعہ بیان فرمایا۔ یورپ میں معمر عورتوں کے حسن اور جوانی کی تعریف کی جائے تو وہ بہت خوش ہوتی ہیں۔ ایک صاحب نے یورپ سے واپس آنے کے بعد اپنی ماں کی کچھ ایسی ہی تعریف کی جس پر وہ بیچاری تین روز تک روتی رہی۔ بھلا مشرقی تہذیب ان چیزوں کی متحمل ہو سکتی ہے۔

مغربی تہذیب کس طرح غیر محسوس طور پر ہمارے تمدن کو تباہ کر رہی ہے اس کا اندازہ اس معمولی واقعہ سے ہو سکتا ہے۔ ایک انگریز نے جو سیر و سیاحت کی غرض سے حیدر آباد آیا ہوا تھا ہندوستانی بچوں کے کھلونے دیکھنے کی خواہش کی کیونکہ اس سے کسی ملک کے تمدن اور ذہنی ارتقاء کا پتہ چلتا ہے لیکن باوجود تلاش کے کسی گھر میں یہ دستیاب نہ ہو سکے۔ ہر جگہ مغربی کھلونوں ہی کی بھرمار تھی۔ بالآخر نواب سالار جنگ بہادر سے استدعا کی گئی اور موصوف نے قدیم وضع کی کچھ گڑیاں بنوا کر اس انگریز کو عنایت فرمائیں۔ بہرکیف مغربی طرز زندگی کی تقلید

اخراجات اتنے بڑھ جاتے ہیں کہ نہ صرف قرض کی مصیبت ہی مول لینی پڑتی ہے بلکہ ہر جائز و ناجائز طریقوں سے آمدنی میں اضافہ کی کوشش کی جاتی ہے۔ حتیٰ کہ آجکل نوجوان اپنی شادی بھی اس مقصد سے کرتے ہیں کہ بیوی کے پیسہ سے ٹھاٹھ کئے جائیں۔

مغربی عورتوں سے شادی کے متعلق پروفیسر حسین علی مرزا نے فرمایا کہ رفتہ رفتہ یہ چیز ہماری نسل اور خون کی خرابی کا باعث ثابت ہوگی اور ہماری حیثیت آئندہ چل کر چیٹکارہ ونکی سی ہو جائیگی۔ ایک انگریز عورت سے شادی کرنے کے بعد کیا یہ توقع کی جاسکتی ہے کہ ہماری تہذیب و تمدن کے اعلیٰ روایات برقرار رہ سکیں اور کیا ہماری اولاد اُن چیزوں کی جائز وارث ہوسکتی ہے جو ہماری معاشرت کا جزو لاینفک ہیں۔ اور پھر اس شادی کے معاملہ میں بھی ہم میں وہی دو عملی ذہنیت کارفرما ہے۔ جس طرح ایک ہندوستانی نوجوان ایک مغربی عورت سے شادی کرلیتا ہے کیا وہ اس کو گوارا کرسکتا ہے کہ اس کی بیٹی یا بہن یا کوئی اور قریبی عزیزہ کسی غیر قوم کے مرد سے شادی کرے۔

ڈاکٹر جے سوریا

ڈاکٹر جے سوریا ایم ۔ ڈی (برلن) مسز سروجنی نائڈو کے فرزند اکبر ہیں ۔ پیشہ کے لحاظ سے آپ ڈاکٹر ہیں لیکن معاشیات و اقتصادیات سے بھی آپ کو غیر معمولی دلچسپی ہے اور ان علوم میں آپ کو اچھی بصیرت حاصل ہے ۔ اپنے تیرہ سالہ قیام یورپ میں آپ نے جرمنی، روس، انگلستان اور دیگر یورپی ممالک کا غائر نظر سے مطالعہ کیا ہے ۔

آپ کا قیام یورپ میں سنہ ۲۱ تا سنہ ۳۴ء رہا ۔

برطانوی تہذیب جب یورپ اور یورپین تہذیب کا ذکر آتا ہے تو اکثر ہندوستانی غیر ارادی طور پر برطانوی تہذیب مراد لیتے ہیں اس خام خیالی کی بادی النظر میں یہ وجہ معلوم ہوتی ہے کہ یورپین زبانوں کے منجملہ ہم صرف انگریزی زبان ہی سے واقف ہیں اور بعض ایسے بھی اسباب ہیں (جو فی الوقت ہمارے قابو سے باہر ہیں) جس کی وجہ سے ہم انگلستان کو

نائبِ عالم سمجھنے پر مجبور رہیں۔ کیونکہ برطانوی ڈگریوں کو ہندوستان میں سارے جہاں کی ڈگریوں کے مقابلہ میں "شاہی ترجیح" حاصل ہے۔ اور یہ ڈگریاں تجارتی نقطہ نظر سے اتنی ارزاں بھی ہیں کہ ایک معمولی تعلیم یافتہ شخص انگلستان جاکر اگر کوئی خانگی اتالیق (جس کی فیس زیادہ ہوتی ہے) مقرر کرلے تو وہ آسانی سے کوئی نہ کوئی ڈگری یا ڈپلوما لیکر واپس آجاسکتا ہے اور یہاں اس کی قدر میں چار چاند لگ جاتے ہیں اور اُسے کم ازکم کسی دیسی ریاست میں تو ایک اعلیٰ ملازمت ملجاتی ہے۔

ہندوستانی اچھوت

لیکن مشکل یہ ہے کہ وہ اوسط طالبعلم جو اس تجارتی ڈگری کے حصول کے لئے انگلستان جاتا ہے اسے اتنا وقت ہی نہیں ملتا کہ وہ وہاں کی سوسائٹی میں گھُل مل سکے۔ بجز انگلستان کی بعض مشہور گلیوں اور سمندری تفریح گاہوں کے وہ کچھ اور دیکھ ہی نہیں سکتا۔ علاوہ ازیں دیکھنے کیلئے وقت درکار ہے اور پیسہ بھی اور ہمارے طالبعلموں کو یہ دونوں میسر نہیں۔ دوسری بڑی مشکل یہ ہے کہ انگریز نیچے کے طبقے سے لیکر اونچے طبقہ تک ہندوستانیوں کو اچھوت سمجھتے ہیں۔ انگلستان کے قیام کے زمانہ میں براعظم کا جو سفر کیا جاتا ہے وہ بالکل اچٹتا ہوا ہوتا ہے اور اس کا دائرہ پیرس اور برلن کے شب بسیروں اور عیش گھروں سے آگے نہیں ہوتا۔

یورپ سے سبق

لیکن ہندوستانی طلباء میں بعض نوجوان طبائع ایسے بھی ہوتے ہیں جو یورپی زندگی کو آنکھیں کھول کر دیکھنا چاہتے ہیں اور سطح سے نیچے جانے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہ لوگ اشیاء کے باہمی تعلق پر نظر کرکے یہ معلوم کرنے کی فکر کرتے ہیں کہ آیا ہندوستانی مسائل کا حل اکسفورڈ کا

لہجہ حاصل کرنے سے ہو سکتا ہے یا اکسفورڈ کی تعلیم ہی محض بیکار ہے جس سے ہندوستانی مسائل کے سلجھانے میں کوئی مدد نہیں ملتی۔ لیکن اُن بیچاروں کو بڑی دقتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ایک طرف اُن کی پڑھائی ہے، اُن کے اور پروفیسروں کے آپس کے تعلقات ہیں، انڈیا آفس کے منکر نکیر ہیں اور گھر کے لوگ ہیں جو اُن سے کسی اور چیز کی توقع نہیں رکھتے بجز اس کے کہ وہ تعلیم ختم کر کے گھر واپس آجائیں اور ایک اعلیٰ خدمت حاصل کریں۔ ایسی صورت میں وہ کر ہی کیا سکتے ہیں۔ لیکن آخر یہ معلوم کرنا ضروری ہے کہ یورپ ہے کیا چیز اور وہاں کی کونسی چیزیں ہمارے ملک کے لئے کارآمد ہو سکتی ہیں اب وقت آگیا ہے کہ ہم کھلے بندوں اس امر کا اظہار کر دیں کہ ہم یورپ سے کچھ حاصل نہیں کر سکتے بجز ایک چیز کے اور وہ اعلیٰ اصطلاحی تعلیم ہے جس سے ہندوستان جیسا زرعی ملک صنعتی ملک بن سکے۔ اصطلاحی تعلیم میں سائنس کے تمام شعبہ جات داخل ہیں بشمول طب کے اور اس سلسلہ میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان چیزوں کے حصول کے لئے بیمار اور تنزل پذیر یورپ سے کہیں زیادہ ترقی یافتہ امریکہ، روس اور جاپان ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کا روئے سخن دیسی ریاستوں کے اُن نام نہاد بلند حوصلہ لوگوں سے نہیں ہے جو کم از کم چھ ماہ ہی کے لئے یورپ جا کر اپنی قدر میں اضافہ کر کے ملازمت حاصل کرنا چاہتے ہیں بلکہ اُن لوگوں سے ہے جو یورپ کو علم کی خاطر علم حاصل کرنے جاتے ہیں اور ایسے علم کی خاطر جس کا ہندوستان میں انتظام نہیں ہے۔ ڈاکٹر جئے سوریا کا خیال ہے کہ قانون، فلسفہ یا تاریخ کی تعلیم کے لئے یورپ جانا عبث ہے اور اس سے ہندوستان کو اب یا آئندہ کسی قسم کا فائدہ نہیں پہنچ سکتا۔

یورپ میں انتشار یورپ میں اس وقت ایک اِنتشار کی کیفیت برپا ہے۔ جن اشیاء کی قدر کل تک معین تھی اُن میں مسلسل تغیر ہوتا جا رہا ہے اور معاشی حالات دن بدن ابتر ہوتے جا رہے ہیں۔ اِن گتھیوں کو سلجھانے کے لئے آئے دن نئے نئے حل پیش ہوتے رہتے ہیں لیکن اُن سے کوئی مفید نتیجہ برآمد نہیں ہوتا۔ یورپ ایک تاریک غار کی طرف بڑھا جا رہا ہے۔ جس کو عبور کرنے کی ممکنہ کوششیں کی جا رہی ہیں۔ اِن تمام لاینحل مسائل کا ایک حل۔ جنگ ہے یعنی اقوام عالم کی خودکشی بر پیمانۂ کبیر۔ تنزل پذیر یورپ کے لئے بجز اس کے کوئی راستہ نہیں ہے۔

. . . .

ہندوستان کا افلاس جہانتک ہندوستان کا تعلق ہے دو زبردست مسائل ہمارے سامنے ایک بھیانک منظر لئے ہوئے پیش ہیں اور جو تقریباً لاینحل نظر آتے ہیں بھوک اور افلاس۔ لہٰذا آئندہ ہم جو بھی تعلیم حاصل کریں اس کا تعلق ان مسائل کے حل سے ہونا ضروری ہے۔ اب تک ہم نے جو بھی تعلیم حاصل کی وہ بیکار ثابت ہوئی کیونکہ اس سے ہمارے مسائل کے سلجھانے میں کوئی مدد نہیں ملی بلکہ اُلٹا تعلیم یافتہ بے روزگاری کا مسئلہ ہمارے مسائل میں ایک ناخوشگوار اضافہ ہے۔ ہندوستان دولتمند ترین ملک ہے جہاں کے لوگ مفلس ترین ہیں۔ کچھ دنوں قبل مجلس اقوام کے شعبۂ تہذیب و تمدن کے ایک رکن بیاسل میاتھیوس نے ہندوستانی نوجوانوں کی حالت بیان کرتے ہوئے کہا تھا کہ نوجوانوں میں اس وقت تک اِنتشار اور بے چینی رہیگی جس وقت تک کہ لوگوں کے افلاس اور بھوک کا علاج نہ کیا جائے گا۔ یہ اندازہ لگایا گیا ہے کہ ہندوستانی کاشتکاروں کے زرعی

قرض کی مقدار پندرہ سو کروڑ روپیوں سے کہیں زیادہ ہے۔ ایسی صورت میں بھوکے مقروض لوگوں سے جو اپنی غذا تک نہیں خرید سکتے دوسری ارزاں ترین اشیاء کے خریدنے کی کیا توقع کیجا سکتی ہے جو متمدن زندگی کے معمولی احتیاجات میں داخل ہیں۔

افلاس کا علاج

تو پھر کیا کیا جائے؟ کیا یورپ یا کسی اور بیرونی ملک کی کسی چیز سے ہم کو کوئی فائدہ پہنچ سکتا ہے؟ ہاں! اصطلاحی تعلیم سے صنعتی ترقی اور صنعتی نظام کے طریقوں سے ہمیں چاہیئے کہ پہلے ہندوستانی معاشیات کے بنیادی مسائل کا جائزہ لیں اور یہ معلوم کرنے کی کوشش کریں کہ ان میں کونسی خرابیاں ہیں اور یہ کیسے دور ہو سکتی ہیں۔ بھوکے لوگ جنھیں جیلخانوں کے قیدیوں کے مقابلہ میں بھی کم غذا ملتی ہے جو کھانا نہ ملنے کیوجہ سے ٹھٹھرے ہوئے ہیں اُن سے بھلا کیا توقع کی جا سکتی ہے کہ وہ پیدائش دولت میں حصہ لیں یا تمدن کی ابتدائی چیزوں کو اختیار کریں۔ وہ محض اس لئے زندہ ہیں کہ اُنھیں مرنا نہیں آتا اور نہ اُنھیں اسوقت تک زندگی کی حقیقت معلوم ہوتی ہے جب تک کوئی ایسے مہلک اور متعدی امراض جو ہندوستان اور چین جیسے افلاس زدہ ملکوں ہی میں پیدا ہو سکتے ہیں ہزاروں کی تعداد میں انھیں فنا کی نیند نہیں سلا دیتے۔ کیونکہ اُن کے خون میں ان بیماریوں کا مقابلہ کرنے کی طاقت نہیں ہے۔ لہٰذا ہمیں یہ معلوم کرنے کی مطلق ضرورت نہیں کہ انھیں کیا کھانا اور کیا نہ کھانا چاہیئے بلکہ ہمیں یہ دیکھنا چاہیئے کہ انکی قوت خرید میں ہم کیسے اضافہ کر سکتے ہیں تاکہ وہ پیٹ بھر تو کھا سکیں۔ جبتک اس مسئلہ کا حل نہ ہوگا اسوقت تک ہر قسم کی دیہی تنظیم، دیہی طبی امداد اور دیگر اصلاحات کا خیال ہی بیکار ہے۔ ایسی صورت میں ہم کو یورپ بلکہ امریکہ، جاپان اور روس سے بجز اصطلاحی تعلیم کے کچھ اور حاصل کرنے کی ضرورت نہیں۔ اور یہی چیز ممکن ہے ہماری نجات کا ذریعہ ثابت ہو۔

مسٹر ایس یم۔ ہادی

مسٹر ایس یم ہادی بی۔ اے (کنٹب) سررشتہ ہائے اسکوٹس سرکار عالی کے ناظم ہیں۔ ایک اسپورٹسمن کی حیثیت سے آپ سارے ہندوستان میں مشہور ہیں۔ آپ کا شمار ٹینس کے بہترین کھلاڑیوں میں رہا ہے اور ڈیوس کپ میں آپ نے ہندوستان کی نمائندگی بھی کی ہے۔

انگلستان میں آپ کا ابتدائی قیام سنہ ۲۱ تا سنہ ۲۵ع رہا۔ اس کے بعد سنہ ۲۹، سنہ ۳۱ و سنہ ۳۳ میں بھی آپ نے یورپ اور امریکہ کا سفر کیا ہے۔ سنہ ۳۶ع میں ہندوستانی کرکٹ ٹیم کے ہمراہ اس کے خازن اعزازی کی حیثیت سے آپ انگلستان تشریف لے گئے تھے۔

انگریزوں کی خصوصیات انگلستان کی زندگی میں تین چیزیں سب سے زیادہ جاذب نظر ہیں۔ فرض شناسی، ضبط و تنظیم اور اخلاق اور یہی انگریزوں کی ترقی کا راز ہیں۔ اپنے لیڈر کی عزت و تعظیم کرنے میں

ہم کو انگریزوں سے سبق حاصل کرنا چاہیئے۔ ہندوستانی کرکٹ ٹیم کے حالیہ سفر انگلستان میں اسی ایک چیز کے نہ ہونے سے ہماری شہرت اور نیکنامی کو صدمہ پہنچا۔ اگر بفرض محال ہندوستانی ٹیم کے کپتان سر مہاراج کمار وجینگرم اہلیت کے جوہر سے عاری تھے تو اس کے متعلق انتخاب کے پہلے ہی غور و خوص ہو جانا چاہیئے تھا۔ انتخاب کے بعد اس سوال کو اٹھانا ہی بیکار تھا۔

جسمانی نشو و نما

میرے اِس سوال پر کہ آیا ہم میں کوئی جسمانی اِنحطاط ہے جس کی وجہ سے ہم اہل یورپ کا کھیل کود میں مقابلہ نہیں کر سکتے مسٹر ایس َیم ہادی نے فرمایا کہ ہم میں جسمانی انحطاط تو نہیں ہے۔ البتہ ہماری تربیت اور نشو و نما کے طریقوں میں اصلاح کی ضرورت ہے۔ ہمارے پاس بچوں کی فطری قابلیتوں کا لحاظ نہیں کیا جاتا۔ لکیر کے فقیر کی طرح بچے مدرسے میں شریک کر دیئے جاتے ہیں اور والدین یہ سمجھتے ہیں کہ اُنھوں نے اپنے بوجھ کو اُستادوں کے کندھوں پر ڈال دیا۔ اور اس طرح ہر قسم کی ذمہ داری سے سبکدوش ہو گئے۔ علاوہ ازیں والدین بچوں کی پڑھائی پر اتنا زور دیتے ہیں کہ بچوں کی جسمانی نشو و نما میں رکاوٹ پیدا ہو جاتی ہے۔ حالانکہ اُصولاً دماغی اور جسمانی دونوں قسم کی تعلیم میں توازن قائم رہنا ضروری ہے۔ اکثر بچوں کا فطری میلان کھیل کود کی طرف ہوتا ہے اور اگر ایسے مواقع بہم پہنچائے جائیں تو کھیل کود ہی میں وہ بڑی ترقی کر سکتے ہیں۔ لیکن اُنھیں موقع نہیں ملتا۔ عام طور پر متوسط اور غریب طبقہ کے لوگ بچوں کو اِس وجہ سے بھی کھیل کود میں زیادہ حصہ لینے نہیں دیتے مبادا وہ اسی کے ہو رہیں اور خاندان کی جو توقعات ان سے وابستہ ہیں وہ پُوری نہ ہوں۔

علاوہ ازیں کھیل کود کے معاملہ میں ہمارے یہاں کی فضا حوصلہ شکن ہے۔ ہمارے کھلاڑی کو خاطر خواہ تحریص اور ترغیب نہیں ملتی۔ حکومت تنہا اس کام کو انجام نہیں دے سکتی، دولت مند لوگ اور خانگی ادارے اس میں دلچسپی نہیں لیتے۔ انگلستان میں عام طور پر جامعاتی ڈگریوں کے مقابلہ میں کیمبرج یا آکسفورڈ (بلیو) لینے والوں کو زیادہ وقعت کی نظروں سے دیکھا جاتا ہے۔

ساتھ ہی ہمارے کھیل کود کی حالت منظم نہیں ہے۔ ملک میں تنظیمی قابلیت والوں کی کمی نہیں لیکن ہمارے افلاس اور عدم توجہی سے کوئی سرمایہ فراہم نہیں ہوتا اور ہر چیز میں محض حکومت پر تکیہ نہیں کیا جا سکتا۔

کھیلوں کے میدان ہمارے پاس کھیل کود کے میدانوں کی بڑی کمی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم باقاعدگی سے کھیل کود کی طرف توجہ نہیں کر سکتے

وبلڈن میں پچیس ہزار ناظرین وقت واحد میں سنٹرل کورٹ کا کھیل دیکھ سکتے ہیں یہاں پر ۱۹۲۱ئہ میں اسٹیڈیم تعمیر ہوا اور پہلے ہی سال اس کے حصہ داروں کو پانچ فیصد منافع ملا اور آجکل منافع کی مقدار (۴۵) فیصد تک پہنچ گئی ہے۔ معین الدولہ کرکٹ ٹورنمنٹ میں ڈیروں کی تنصیب سے بمشکل دو ہزار روپیہ کرایہ وصول ہوتا ہے حالانکہ ڈیرے لگانے والے کافی منافع حاصل کرتے ہیں۔ حسین ساگر کٹہ کے زیریں میدان میں ایک اسٹیڈیم تعمیر کرنے کی تحریک عرصہ سے حکومت سرکار عالی کے پیش نظر ہے جو نہ صرف ہماری ریاست کے وقار کے شایان شان ہے بلکہ اس میں ہماری نوجوان نسلوں کے لئے بھی بے حد فوائد مضمر ہیں۔

عورت مسز ایس۔ یم ہادی ہمارے موجودہ چار دیواری کے پردے میں ترمیم کے

حامی ہیں۔ آپ کے خیال کے بموجب یورپین عورتوں کو ورزش کی اتنی ضرورت نہیں جتنی کہ ہماری عورتوں کو ہے۔ لہذا ان کے کھیل کود کے لئے دو ایک ایسے میدان مخصوص ہونے چاہیں جہاں عورتیں ہر شام جمع ہو سکیں اور جہاں پردے کا بھی کافی انتظام ہو۔ عورتوں کے لئے فٹ بال یا دوسرے کھیلوں کے مقابلہ میں ہاکی اور ٹینس بہتر ہیں بلکہ ہمارے زنانہ مدارس میں ان کھیلوں کا رواج ہونا چاہیئے اور انکے ٹورنمنٹ بھی ہونے چاہیں۔

یورپ کی عورتوں کی آزادی کے بیان کرنے میں ہمارے پاس انتہائی مبالغہ سے کام لیا جاتا ہے۔ انگلستان میں بہت سے ایسے شریف خاندان ہیں جہاں عصمت مشرقی معیار تہذیب کے مطابق قائم ہے۔ عورتیں عام طور پر اپنے پیروں پر کھڑے رہنے کی کوشش کرتی ہیں۔ میرے اس اعتراض پر کہ اس سے گھر کی زندگی تباہ ہو جاتی ہے مسٹر ہادی نے فرمایا کہ ممکن ہے ایک حد تک یہ خیال صحیح ہو لیکن اس سے خاندان تباہی سے بچ جاتا ہے۔ اگر خاندان میں ایک مرد کمانے والا ہو اور وہ فوت ہو جائے تو خاندان کے لئے بجز بھیک کے کوئی سہارا باقی نہیں رہتا۔ لیکن اگر عورتیں پہلے ہی سے اپنی روزی آپ کماتی ہیں تو وہ اس قسم کی شدید صورت حال کا آسانی سے مقابلہ کر لے سکتی ہیں۔

یورپ میں بڑے بڑے گھرانے کی عورتیں باوجود تمول کے اپنی آمدنی بڑھانے کی فکر میں رہتی ہیں۔ اس سلسلہ میں آپ نے لارڈ سوآئلنگ آنجہانی کے خاندان کا تذکرہ فرمایا جو لارڈ مانٹیگو وزیر ہند کے بڑے بھائی تھے ان کی خاندانی شرافت کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ شاہ جارج پنجم آنجہانی بھی ان کے پاس

ایک روز مہمان تھے۔ لیڈی سوآتلنگ کے متعلق آپ نے فرمایا کہ وہ ایک بہترین بیوی بہترین ماں اور بہترین میزبان تھیں۔ ایک مرتبہ مسٹر ایس ایم ہادی ان کے مکان میں بیمار ہو گئے تو اُن کی تیمار داری میں اُنہوں نے کوئی کسر اُٹھا نہ رکھی حتیٰ کہ جب اُنہیں خیال ہوا کہ ممکن ہے انگریزی کھانوں سے آپ کی طبیعت اکتا گئی ہو تو سر علی امام کو جو برار کے معاملہ میں لندن آئے ہوئے تھے ٹیلیفون کیا گیا اور اُن کے پاس سے کھچڑی اور پاپڑ کا انتظام ہوا۔

ترکہ تقسیم ہونے کے بعد لیڈی سوآتلنگ کی اکلوتی لڑکی اپنی ماں کو گھر کا کرایہ اور اپنے کھانے کے اخراجات ادا کرتی تھی اور خود ایک دکان لگا کر اس میں کام کیا کرتی تھی۔ جب مسٹر ایس ایم ہادی نے اس پر تعجب کا اظہار کیا تو لیڈی سوآتلنگ نے ہنسکر فرمایا کہ جبتک جائداد غیر منقسم تھی اور لڑکی خاندان کی دستنگر تھی تو اس کے ساتھ ہر قسم کا سلوک کیا گیا لیکن جب وہ خود ایک جائداد کی مالک بن گئی ہے اور اس کی اپنی ایک دکان بھی ہے تو دوسرے اس کا بار کیوں اٹھانے لگے۔ یہ دراصل انگلستان کی کاروباری ذہنیت کا نتیجہ ہے۔

نسلی تعصب

میرے اس سوال پر کہ کیا انگلستان میں کھیل کود کی دنیا میں بھی نسلی تعصب پایا جاتا ہے مسٹر ایس ایم ہادی نے فرمایا کہ بد قسمتی سے اسپورٹ کی دنیا میں بھی یہ چیز موجود ہے جس کا خود آپ کو کیمبرج میں شکار ہونا پڑا۔ آپ کو محض ٹینس کے بہترین کھلاڑی ہونے کی وجہ سے ۲۲ء میں بلیو ملا۔ اس کے کچھ دنوں بعد کیمبرج یونیورسٹی کی ایک ٹینس ٹیم بلجیم روانہ کی گئی جس میں مسٹر ہادی اور راما سوامی بھی شریک تھے۔ روانگی کے قبل ٹیم کے کپتان نے ان دونوں سے

کہا کہ چونکہ بلجیم میں نسلی تعصب زیادہ ہے لہٰذا اِن دونوں کے کھیلنے کے لئے خاص طور پر اجازت حاصل کی گئی ہے۔ یہ چیز مسٹر ہادی کے دل میں کانٹے کی طرح کھٹکنے لگی۔ علاوہ ازیں بلجیم پہنچنے کے بعد ان دونوں ہندوستانیوں کی رہائش کا انتظام ایک ہوٹل میں کیا گیا اور ٹیم کے بقیہ لوگ ایک فیملی میں ٹھہرے۔ اس واقعہ کو بھی آپ لوگوں نے زیادہ اہمیت نہیں دی۔ جب میچ شروع ہوئے تو آپ دونوں اپنے کھیل اور اخلاق کی وجہ سے بیحد مقبول ہو گئے۔ ہر شخص ان کے ساتھ خندہ پیشانی کے ساتھ پیش آرہا تھا۔ لیکن رہ رہ کر مسٹر ہادی کو ہندوستانیوں کی سبکی کا خیال ستا رہا تھا۔ آپ سے رہا نہیں گیا۔ آپ نے بلجیم ٹیم کے کپتان سے سارا واقعہ بیان کیا اور ان کے اس طرزِ عمل کی مذمت کی جس پر اس نے برہم ہو کر اپنی لاعلمی کا اظہار کیا اور اپنی صفائی میں کیمبرج ٹیم کے کپتان کا وہ خط پیش کیا جس میں تحریر کیا گیا تھا کہ ٹیم میں دو ہندوستانی کھلاڑی بھی ہیں جن کے متعلق ممکن ہے بلجیم میں اعتراض ہو لہٰذا انھیں خاص طور پر کھیلنے کی اجازت دیجائے۔ کیمبرج ٹیم کی واپسی کے بعد حکومت بلجیم نے سرکاری طور پر اس غلط بیانی کے خلاف احتجاج کیا جس کی انگلستان نے معذرت چاہی۔

اسیطرح مسٹر ایس ایم ہادی کے کپتان منتخب ہونے کے وقت ایک شور مچایا گیا۔ کیمبرج میں کپتان کا انتخاب وہاں کے " بلیو " کرتے ہیں۔ آپ سب میں سینیر تھے لیکن انتخاب کے قبل کلب کے صدر نے آپ سے خواہش کی کہ ہندوستانی ہونے کی وجہ سے آپ کے انتخاب سے یونیورسٹی کے روایات کو صدمہ پہنچیگا اور پبلک میں چہ میگوئیاں ہونگی -- لہٰذا مناسب یہ ہے کہ آپ کپتانی کے لئے کھڑے ہی نہوں۔ اس سے آپ کے قومی جذبات کو سخت

ٹھیس لگی اور آپ نے اس مشورہ کو ٹھکرا دیا۔ لیکن جب آپ کے ساتھ انتخاب کنندگان کا طرزِ عمل ناقابل برداشت ہو گیا تو آپ نے یونیورسٹی کورٹ پر کھیلنا ہی چھوڑ دیا اور دوسری جگہ کھیلنے لگے۔ یہ بات عام ہو گئی۔ اخبارات میں چرچے ہوئے۔ آپ کے بیانات شائع ہونے لگے حتیٰ کہ مہاتما گاندھی نے بھی "ینگ انڈیا" میں اس پر تبصرہ کیا۔ بالآخر اس نازک صورتِ حال پر آپ کو کپتان منتخب کر کے قابو حاصل کیا گیا۔ اس سارے جھگڑے میں آپ کو افسوس اس بات کا ہے کہ آپ کے دو ہندوستانی ساتھیوں میں سے ایک نے ساتھ نہیں دیا۔ دوسرے سال بلجیم جانے والی ٹیم کا آپ کو کپتان بنایا گیا جس کی وجہ غالباً یہ معلوم ہوتی ہے کہ کیمبرج یونیورسٹی اپنی سابقہ خفّت کو مٹانا چاہتی تھی۔ لیکن آپ سے ٹینس کی اس کامیابی کا انتقام ہاکی میں لیا گیا۔ اور ہاکی کے بہترین کھلاڑی ہونے کے باوجود آخر وقت تک آپ کو اس کا "بلیو" نہیں ملا۔

ہندوستانی کرکٹ ٹیم کی ناکامی

ہندوستانی کرکٹ ٹیم کے حالیہ سفرِ انگلستان کی ناکامی کے وجوہ دریافت کرنے پر مسٹر ایس/ یم ہادی نے جو اس ٹیم کے اعزازی خازن تھے، فرمایا کہ ہمارے کھلاڑیوں میں قومی احساس کی کمی ہے۔ ہر شخص اپنے ملک کی نیکنامی سے زیادہ اپنی شہرت کا خواہاں تھا۔ کھلاڑیوں کی انانیت، خود غرضیاں، رقابتیں اور کمزور سرکردگی نے ہندوستان کی شہرت کو ناقابل بیان نقصان پہنچایا۔

خاتمہ

ہم میں ڈسپلن کی بڑی ضرورت ہے۔ یورپ میں اسپورٹس کو فوجی ڈسپلن سے بہتر سمجھا جاتا ہے۔ جرمنی نے اس کی وجہ سے جو غیر معمولی قوت

بہم پہنچائی ہے اس سے سیاست حاضرہ کا ہر طالبعلم واقف ہے۔ حال ہی میں یعنی ماہ جون ۳۶ء میں جسمانی تعلیم اور اسپورٹس کے لئے فرانس میں ایک وزارت قائم ہوئی ہے کیونکہ یورپی ممالک یہ محسوس کرنے لگے ہیں کہ سلطنت کے دیگر امور کے مقابلہ میں جسمانی تربیت کو زیادہ اہمیت دی جانی چاہیئے۔

آخر میں مسٹریس یم ہادی نے فرمایا کہ ہر ہندوستانی کو اپنے ملک کی عزت اور ناموس کا سب سے زیادہ خیال رکھنا چاہیئے۔ جو لوگ ہندوستان سے غیر ممالک تعلیم یا سیاحت کی غرض سے جاتے ہیں انھیں اپنے ملک کا سفیر بنکر جانا چاہیئے کیونکہ ایک فرد کے اطوار اور کردار سے سارے ملک اور قوم کے متعلق رائے قائم کی جاتی ہے۔

ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم

ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم م۔ اے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی (ہائیڈلبرگ) جامعۂ عثمانیہ کے شعبۂ فلسفہ کے صدر ہیں۔ ایک بلند پایہ شاعر، مقرر، اور ادیب کی حیثیت سے آپ سارے ہندوستان میں مشہور ہیں۔ فلسفۂ رومی آپ کا خاص مضمون ہے، جس پر آپ نے اپنا مقالہ بھی تحریر فرمایا ہے۔

آپ کا قیام جرمنی میں ۲۲ء تا ۲۵ء رہا۔ کچھ دنوں لندن اور کیمبرج میں بھی آپ نے تحقیقات فرمائی ہیں۔ ۳۲ء میں بھی چھ ماہ کے لئے آپ یورپ تشریف لے گئے تھے اور یہ مدت آپ نے فرانسیسی زبان کے حصول میں صرف کی اور جامعہ سوبورن (پیرس) میں شریک رہے

یورپ کی ترقی کے دَور

میرے اس سوال پر کہ یورپ کی ترقی کے کیا اسباب ہیں ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم نے فرمایا کہ مشرقی یورپ کے اکثر ممالک ہندوستان کے مقابلہ میں کوئی زیادہ ترقی یافتہ

نہیں ہیں۔ لیکن جو ممالک واقعی ترقی یافتہ ہیں مثلاً انگلستان، جرمنی اور فرانس اُن کی ترقی کے اسباب معلوم کرنے کے لئے ہم کو گذشتہ دو تین سو برس پہلے کی تاریخ پر نظر ڈالنے کی ضرورت ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ یورپ کی ترقی کی ابتدا نشاۃ جدیدہ سے ہوتی ہے جبکہ قسطنطینیہ پر ترکی قبضہ کے بعد یونانی عالموں کی جماعت نے اقصائے یورپ میں پھیل کر سارے یورپ میں علم کی روشنی پھیلائی۔ علوم و فنون کی اِس اشاعت نے لوگوں کی آنکھیں کھول دیں اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اکثر یورپی ممالک نے کلیسا کے جوئے کو اتار پھینکا۔ یورپ کی ترقی کی یہ دوسری منزل ہے۔ یورپ کا تیسرا قدم جو ترقی کی طرف اُٹھا وہ بحری راستوں کی دریافت ہے جس سے نہ صرف یورپین ممالک کی تجارت کو فروغ ہوا بلکہ کمزور قوموں پر تسلط قائم کرنے کا موقع بھی ہاتھ آیا۔ اِس کا بانی مبانی واسکوڈی گاما ہے جس کو ہندوستان کا راستہ احمد نامی ایک عرب نے تبلایا تھا۔ کاش احمد کو معلوم ہوتا کہ اس گم کردہ راہ کو راستہ تبلانے میں اکثر مشرقی اقوام کی قسمتوں میں غلامی لکھی جانے والی ہے:

جہاز رانی کے فروغ کے ساتھ یورپ کے اقبال کا ستارہ چمکا۔ اس جہاز رانی سے یورپی ممالک نے سب سے پہلے لوٹ اور غارتگری کا آغاز کیا۔ چنانچہ انگلستان کی ترقی کی بنیاد لُوٹ پر قائم ہوئی۔

اِنگلستان کی قومی دولت کی فراوانی اور خوشحالی کی ابتدا ملکہ الزبتھ کے دورِ حکومت سے ہوتی ہے۔ یہ سولھویں صدی کے وسط کا زمانہ ہے۔

ڈریک کو ہسپانوی بیڑے کو لوٹنے کی اِس شرط پر اجازت دیگئی کہ مالِ غنیمت میں

ملکہ کا بھی حصہ رہیگا۔ اسی حصہ کی بدولت ملکہ الیزبیتھ نے نہ صرف اپنا قرض ادا کیا بلکہ دیگر اخراجات کے بعد بھی کافی دولت بچائی۔ ڈریک کی حوصلہ مندی کی وجہ سے جب ملک میں سونے کی بہتات ہوئی تو اکثر لوگوں نے اس کے مصرف پر غور کیا اور ان کے ذہن میں یہ خیال پیدا ہوا کہ اس سے تجارتی کمپنیاں قائم کی جائیں جو دنیا کے مختلف ممالک سے تجارتی تعلقات پیدا کریں۔ یہیں سے ایسٹ انڈیا کمپنی کی ابتداء ہوتی ہے۔

یہ وہ زمانہ تھا کہ انگلستان کی آبادی کم تھی اور ملک کی خوشحالی میں اضافہ ہونے لگا تھا۔ سوچنے والے دماغ اس فکر میں لگے ہوئے تھے کہ کس طرح کم سے کم لوگوں سے زیادہ سے زیادہ کام لیا جائے۔ یہیں سے ایجادات واختراعات کا سلسلہ شروع ہوتا ہے اور یہی چیز صنعتی انقلاب کی محرک ہے۔

یہاں یہ امر قابل ذکر ہے کہ انگلستان کے جن لوگوں کے ہاتھوں میں ڈریک کی وجہ سے دولت آگئی تھی وہ طبقۂ جاگیرداران سے نہیں تھے۔ ملک میں عوام کا ایک نیا طبقہ پیدا ہو رہا تھا جو رفتہ رفتہ نہ صرف دارالعوام کی تقویت کا باعث ہوا بلکہ جس سے نظام پارلیمانی میں استحکام اور برطانیہ کی طاقت میں اضافہ بھی ہوا۔

یورپ کی ترقی کا راز

سائنس کی ترقی دراصل صنعتوں کی ترقی کا نتیجہ ہے اور صحیح معنوں میں سائنس اور صنعت کی ترقی ہی یورپ کی ترقی کا راز ہیں۔ انگلستان کی ترقی کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ یہ ایک چھوٹا جزیرہ ہے۔ بلحاظ آبادی انگریزوں کی تعداد زیادہ نہیں ہے لیکن نسل، زبان اور مذہب کے اعتبار سے یہ لوگ ایک ہیں۔ ان میں قومی ہمدردی اور یکرنگی پیدا

ہونے کے زیادہ امکانات تھے۔ ساتھ ہی براعظم کی دوسری بڑی طاقتوں کی دستبرد سے محفوظ رہنے کے لئے بھی ان میں اتحاد و یگانگت کا پیدا ہونا ضروری تھا۔

یورپ کی ترقی میں انقلاب فرانس کو بھی بڑا دخل ہے جس سے حریت، آزادی اور جمہوری خیالات کی ترویج میں بڑی مدد ملی۔

مغربی یورپ کی ترقی کا ایک بڑا سبب عیسائیت سے بیزاری اور بغاوت ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ عیسائی مذہب بہت بودا ہے۔ دنیا میں کسی مذہب کی اتنی مخالفت نہیں ہوئی جتنی کہ عیسائیت کی ہوئی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ عیسائیت نے اپنے پیروؤں کے سارے قوائے ذہنی و عقلی کو سلب کر لیا تھا اور افراد کو دنیا میں ابھرنے کا موقع ہی نہیں ملتا تھا۔ عیسائیت سے پیچھا چھڑانے کے بعد لوگوں نے ازسرِنو زندگی کے نئے نئے تجربات کرنے شروع کئے۔ سوسائٹی، مذہب اخلاق، قانون، سیاسیات، غرض ہر چیز کے متعلق تحقیقات کے دفتر کھلنے لگے اور یورپ کی وہی کیفیت ہوگئی جو کسی زمانہ میں یونان کی تھی جہاں سقراط، ارسطو اور دیگر مفکرین نے آزادیِ فکر کے ذریعہ حیاتِ انسانی سے ساری مزاحمتوں کو ہٹا دیا تھا۔

مگر اس تمام ترقی اور آزادی کا فائدہ متوسط اور تجارتی جماعتوں کو پہنچا۔ مزدور پیشہ لوگ ان تمام انقلابات سے غیر متاثر رہے۔ لہٰذا آخر میں ایک ایسے انقلاب کی ضرورت تھی جس میں مزدور پیشہ لوگوں کو اُبھرنے کا موقع ملتا۔ "عوام الناس کے انقلاب" کی یہی ابتداء ہے۔

اس سلسلہ میں ایک عام مغالطہ دور ہونا ضروری ہے۔ وہ یہ کہ مشرقی ممالک میں

یہ خیال عام ہے کہ یورپ نے مادی ترقی کی ہے اور روحانیت سے اُسے کوئی سروکار نہیں ہے۔ یہ ایک مغالطہ ہے اور اس کے پیدا ہونے کی یہ وجہ ہے کہ گذشتہ دو صدیوں میں فطرت کی قوتوں کو سمجھنے اور اُن کو بروئے کار لانے میں دنیا نے اتنی سرعت سے ترقی کی ہے کہ گذشتہ دس ہزار سال میں بھی اتنی ترقی نہیں ہوئی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ یورپ کی مادّی ترقی سب سے زیادہ نمایاں نظر آتی ہے اور اس کے مقابلہ میں روحانی اور اخلاقی ترقی کی رفتار سست ہے۔ لیکن اس کے ہرگز یہ معنی نہیں ہیں کہ یورپ کی اخلاقی یا روحانی حالت پہلے سے بدتر ہوگئی ہے۔ آجکل یورپ میں جو مذہبی لوگ ہیں وہ ازمنہ وسطیٰ کے کلیسائی لوگوں سے بہتر عیسائی ہیں کیونکہ ایک طرف ان میں ذہنی شائستگی ہے تو دوسری طرف جمہوری تحریکات اور رجحانات کی وجہ سے ان میں معاشری خدمت گذاری کا جذبہ عام ہوگیا ہے۔ آجکل کا پادری تثلیث کے رموز سمجھانے یا آخرت کی دھمکیاں دینے کی بجائے خدمت خلق کی طرف زیادہ مائل ہے۔

یورپ کے متعلق ایک خیال یہ بھی ہے کہ وہاں خود غرضی کی بیکار بہت چھائی ہوئی ہے۔ لیکن تاریخی لحاظ سے یہ کوئی اُنوکھی چیز نہیں ہے۔ مختلف انسانوں کے گروہ مختلف انسانوں سے ہمیشہ لڑتے رہے ہیں۔ یورپ کی ان مادّی اور علمی ترقیوں کے بعد یہ امر بالکل ناگزیر تھا کہ پسماندہ اقوام خواہ وہ دنیا کے کسی حصہ میں ہوں اُن کے قبضہ اقتدار میں آجائیں۔

یہاں اس مغالطہ کا ذکر بھی ضروری ہے جو خود اہل یورپ کو اپنے متعلق پیدا ہوگیا ہے کہ نسل کے اعتبار سے دنیا کی دوسری اقوام کے مقابلہ میں انہیں فوقیت

حاصل ہے۔ یہ مغالطہ گذشتہ صدی میں پورے یورپ پر ایک یقین اور ایمان کی طرح طاری تھا۔ اس بت کے توڑنے میں سب سے پہلے جاپان نے پیش قدمی کی۔ جاپان کا روس کو شکست دینا ایک ملک کی شکست نہیں تھی بلکہ پوری تہذیب جدید کی شکست تھی۔ لیکن یہ مغالطہ ابھی دور نہیں ہوا اور اب بھی مغرب میں کثرت سے ایسے لوگ ملتے ہیں جو اپنے ملک اور قوم میں اس مغالطہ کی پرورش کرنا اپنا بہترین فرض سمجھتے ہیں۔ مسولینی اور ہٹلر کا بہت کچھ دار ومدار اسی مغالطہ پر ہے۔ نیٹشے کے بعض شاگردوں نے اس کے فلسفہ کی غلط تعبیر کر کے اس خیال کو تقویت بہم پہنچائی کہ آئندہ منازل ارتقا میں فوق الانسان ہستیوں کی ایک نوع پیدا ہونے والی ہے اور وہ سفید رنگ کے اقوام ہی سے ہوگی۔ واقعہ یہ ہے کہ ترقی کے گھمنڈ میں نسلی تفوق یا مغالطہ کا پیدا ہونا تاریخ میں کوئی نئی چیز نہیں ہے۔ عربوں کا جب اسلام کی قوت سے دنیا پر تسلط قائم ہوا تو بعض عرب مصنفین نے اہل فرنگ کے متعلق یہ لکھا تھا کہ سرد ممالک کے لوگ سردی کی وجہ سے غبی ہو جاتے ہیں اس لئے علوم وفنون میں ان کو کبھی کمال حاصل نہیں ہو سکتا۔

مغرب کی ترقی کا ایک بڑا راز قومیت کا فروغ ہے۔ اس سے پہلے کبھی کوئی قوم بحیثیت قوم کے نہیں سوچتی تھی۔ رومن شہنشاہیت اور کلیسا کی قوت ٹوٹنے کے بعد یورپ کے مختلف گروہوں میں قومی اتحاد کا خیال پیدا ہوا چھوٹے گروہ بھی جب بحیثیت ایک قوم کے منظم ہوتے ہیں تو ان کو بڑی قوت حاصل ہو جاتی ہے ان گروہوں کو حب وطن کی بنا پر ایک دوسرے کے مقابلہ میں اس قدر کشمکش کرنی پڑی کہ ان کی تمام خفتہ قوتیں بیدار ہو گئیں۔ یورپ کی جنگیں اور شدید تباہیاں

اسی حُب وطن کا نتیجہ ہیں لیکن اس کے ساتھ ہی یورپ کی تمام ترقی بھی اسی جذبہ کی رہینِ منت ہے۔ اسی جذبہ سے اب بھی قومیں اپنے آپ کو سنبھال رہی ہیں اور ترقی کر رہی ہیں۔ لیکن یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہی جذبہ یورپ کی خودکشی کا باعث ہو۔

ے دیکھ لوگے سطوت رفتارِ دریا کا مآل
موج مضطر ہی اسے زنجیرِ پا ہو جائیگی

عورت یورپ میں جنسی تعلقات پر اتنی شدید پابندیاں کبھی نہیں رہیں جتنی کہ اکثر مشرقی تہذیبوں میں ملتی ہیں وہاں جنسی تعلقات مشرق کی بہ نسبت بہت زیادہ آزاد رہے ہیں۔ حتیٰ کہ پوپ جیسی برگزیدہ ہستیوں نے بھی عورتوں سے ناجائز تعلقات رکھے اور ان کے اولاد بھی ہوئی۔ یورپ میں ایک زمانہ ایسا بھی تھا کہ مہمان کی خاطر تواضع میں گھر کی عورتوں کو پیش کرنا اچھے آداب واطوار میں داخل تھا اور اس کا جابجا رواج بھی تھا۔ آج سے ڈیڑھ سو سال قبل تک عورتیں علانیہ مارکٹ میں نیلام ہوتی تھیں اور بعض خاوند اپنی بیویوں کو سر بازار نیلام کر دیتے تھے۔

یورپ میں جنسی بداعتدالیوں کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ کلیسا تعدد ازدواج کا حامی نہیں ہے۔ قانوناً اور مذہباً ایک سے زائد عورت سے شادی نہیں کیجاسکتی حالانکہ بعض حالات میں انسان ایک عورت پر اکتفاء نہیں کر سکتا۔ کلیسا کی ان ہی پابندیوں کیوجہ سے یورپ میں ناجائز جنسی تعلقات کو غیر معمولی فروغ حاصل ہوا۔

باوجود ان ساری باتوں کے انیسویں صدی کے آخر تک عورتوں پر کچھ پابندیاں ضرور عائد تھیں اور کھل کھیلنے کا موقع عام نہیں تھا۔ صنعتی انقلاب نے

عورتوں کو معاشی طور پر آزاد کرنا شروع کیا اور بڑی کثرت سے عورتیں اور مرد اپنے اپنے دیہاتی اور قصباتی ٹھکانوں سے اکھڑ گئے اور شہروں کے انجان اور بے پہچان ہجوموں میں گھس کر سارے رسوم اور قیود سے آزاد ہو گئے۔ بڑے بڑے کارخانوں کے مزدور واڑوں میں دور دور سے آئے ہوئے مردوں اور عورتوں کے اختلاط نے جنسی بداخلاقی کے تمام دروازے کھول دیئے۔ یہ اسی قسم کی صورت حال ہے جو بمبئی کے کارخانوں کے مزدوروں کے طرز ماند و بود میں پائی جاتی ہے۔ اسی سلسلہ میں زندگی کے مختلف شعبوں میں عورتوں کی ملازمت عام ہوتی گئی۔ جو عورتیں زندگی کے عام کاروبار میں بے تعلق مردوں کی ملازمت کرتی ہیں اور صبح سے شام تک اُنھیں رنگا رنگ کے مرد ہم کار ملتے ہیں تو پھر اُن کے لئے اپنی عصمت کا بچانا ناممکن ہے۔ اِلّا ماشاء اللہ۔

یہاں اِسلام کی اِس خوبی کو بیان کرنا ضروری ہے کہ فطرت کی جن قوتوں سے آپ بچکر نہیں نکل سکتے ہیں اِسلام نے ان میں ایک تنظیم کی شکل پیدا کر دی ہے اور شتر مرغ بننے کی کبھی کوشش نہیں کی مثال کے طور پر مسلمانوں میں جو لونڈیوں کا رواج ہے اس کے متعلق اِسلام نے خاص اصول وضوابط مقرر کر دیئے ہیں۔ تعدد ازواج کی خاص اشکال ہیں جن سے بدکاری و زنا کاری کا قلع قمع ہو جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بالشوی ممالک میں عورتوں کی حالت نسبتاً اچھی ہے۔ چنانچہ روس میں اِسلامی ممالک کی طرح چکلے نہیں ہیں۔ مرد اور عورت آزاد ہیں۔ نکاح اور طلاق میں غیر معمولی سہولتیں ہیں۔

یورپ میں عورتوں کی آزادی کا تیسرا قدم جنگ عظیم ہے۔ مرد تو میدان جنگ میں تھے

اور عورتوں نے ملک میں رہ کر آزادی حاصل کر لی۔ مردوں کا سارا کاروبار اُنھوں نے سنبھال لیا جس سے ان میں بڑی خود اعتمادی پیدا ہو گئی۔ ساتھ ہی جنسی تعلقات بڑی کثرت سے ناجائز پیدا ہونے شروع ہو گئے۔ زمانۂ جنگ میں جب فوجیں کسی حصۂ ملک پر قابض ہوتی تھیں تو وہاں کی عورتیں بڑی کثرت سے برضا و رغبت یا بالجبر فوجیوں کے ساتھ آلودہ ہو جاتی تھیں۔

عورتوں کی تقلید

مشرق کے لئے اب بڑا سوال یہ ہے کہ عورتوں کے ساوی حقوق تسلیم کرتے ہوئے اُن کو زندگی کی جد و جہد کے مختلف شعبوں میں داخل ہونے کی اجازت دیتے ہوئے اور ان کی آزادانہ نشو و نما کے لئے ان کے راستہ سے تمام رکاوٹوں کو دور کرتے ہوئے کیا طریق زندگی اختیار کرنا چاہیئے جس سے وہ خوبیاں تو حاصل ہو جائیں جو آزادی کے صحیح استعمال سے حاصل ہو سکتی ہیں لیکن وہ خرابیاں پیدا نہ ہوں جو یورپ میں نظر آتی ہیں آیا اس سلسلہ میں خذ ما صفا دع ما کدر ممکن بھی ہے یا نہیں اس کا جواب آنے والے واقعات ہی دے سکینگے۔ مغرب میں عورتوں کی بے لگام آزادی نے بعض ایسے خوفناک نتائج پیدا کئے کہ مشرق والوں کے اِس خیال کو تقویت ہو گئی کہ چار دیواری ہی عورتوں کے لئے موزوں و درست مقام ہے۔ لیکن کوئی شخص بھی جو اپنی قوم کے حالات سے صحیح طور پر واقف ہے اس سے انکار نہیں کر سکتا کہ رسمی پردے کی شدتوں نے نہ صرف عورتوں کو اپاہج کر دیا ہے بلکہ تمام جسد قومی اس سے مفلوج ہو گیا ہے۔

قابل تقلید خصوصیات

مہذب یورپ کا عام انسان ہمارے ہموطنوں کے

مقابلہ میں بہت زیادہ محنتی اور بہت زیادہ فرض شناس ہوتا ہے۔ اس معاملہ میں خصوصیت سے انگریز اور جرمن قوم بہت زیادہ قابل تقلید ہے۔ جرمنوں کی ایک عام قومی خصوصیت یہ ہے کہ وہ جس کام میں ہاتھ ڈالتے ہیں اسے پایۂ تکمیل کو پہنچاتے ہیں۔ قومی ڈسپلن جتنا جرمنی میں پایا جاتا ہے اتنا دنیا کی کسی قوم میں شاید آج تک نہیں پایا گیا۔ ہر چیز کے لئے ایک قاعدہ اور قانون ہے۔ اور سوسائٹی کا نظام اس قسم کا ہے کہ ہر فرد کو قاعدہ کی پابندی کرنے کے بغیر چارہ نہیں ہے تمام زندگی زنجیر آئین میں جکڑی ہوئی ہے اور ہر فرد کو اس کا احساس ہے کہ آئین کی پابندی ہی سے افراد اور اقوام حقیقی آزادی سے بہرہ ور ہو سکتی ہیں۔

ہندوستان کی ترقی کی پہلی منزل وہ ہوگی جبکہ ہندوستانیوں میں صحیح معنوں میں حب وطن پیدا ہو جس کے معنی یہ ہیں کہ اس ملک کے مختلف گروہ اپنی مذہبی و اقتصادی کشاکش کو چھوڑ کر ملک کی بہتری اور آزادی کے لئے کوشش کریں گے۔ ابتک اس ملک کی یہ حالت ہے کہ افراد یا تو اپنی انفرادی خود غرضی میں مبتلا ہیں یا مختلف گروہ فریقانہ تعصب کے شکار ہیں۔ جب تک یہ صورت حال باقی ہے اس ملک کی تمام قومیں باہمی کشاکش میں اسی طرح غارت ہوتی رہیں گی جس طرح ایک بڑی ندی ریگستان میں سے گذرتے ہوئے گم ہو جاتی ہے۔

یہ تمدن کا ایک عام اصول ہے کہ جب پسماندہ اقوام کا ترقی یافتہ اقوام کے ساتھ واسطہ پڑتا ہے تو پسماندہ قومیں پہلے ترقی یافتہ قوموں کے ظواہر اور اُن کے عیوب کی نقل کرتی ہیں۔ ہماری قوم ابھی اسی منزل سے گذر رہی ہے۔ پرستاران مغرب کا زیادہ تر گروہ ایسا ہے جو انگریزی کپڑوں، انگریزی طرز ماند و بود، انگریزی خوراک اور

اسی طرح بعض اور ظاہری چیزوں میں اہل یورپ کی تقلید کرنے کے بعد اپنے آپ کو ترقی یافتہ سمجھکر مطمئن ہو جاتا ہے۔ یہاں یہ امر بیان کرنا ضروری ہے کہ اہل مغرب نے پہلے علوم و فنون کو حاصل کیا اور اس کے بعد اپنی محنت اور اولوالعزمی سے افزائش دولت کی طرف توجہ کی اور اپنی معیار زندگی اور رہائش کو ایک خاص سطح تک بلند کیا لیکن ہمارے مفلس اور اپاہج ملک نے علوم و فنون کے حصول کی کوشش اور افزائش دولت کی جد وجہد کے بغیر دولتمند اقوام کی نقل شروع کر دی جس سے ملک کو شدید نقصان پہنچا۔ اس لحاظ سے مہاتما گاندھی نے بڑا شاندار کام کیا کہ آزادی کی جد وجہد میں سادگی کو زندگی کی ضروری اساس قرار دیا۔ افسوس ہے کہ مسلمانوں نے جو اپنے دوسرے ہموطنوں کی بہ نسبت بہت زیادہ مفلس ہیں اور جن کو سادگی کی بہت زیادہ ضرورت ہے ابھی اس طرف توجہ نہیں کی۔

پیام | پہلے مغرب کی دولت پیدا کرو، مغرب کی ہمت پیدا کرو، مغرب کا حب وطن پیدا کرو اور مغرب کا ذوق حریت پیدا کرو، اس کے بعد مادی آسائشیں خود بخود پیدا ہو جائینگی۔ گاڑی کو آگے اور گھوڑے کو پیچھے مت کرو۔

ان سب باتوں کے باوجود مشرقی انسان کو یہ فراموش نہیں کرنا چاہیئے کہ وہ بڑی بڑی عظیم الشان تہذیبوں کا وارث ہے۔ زندگی کے اعلیٰ نصب العینوں کیلئے مشرقی انسان کو محض مغرب کا دریوزہ گر ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ نہ اس بات کی ضرورت ہے کہ وہ جھوٹے فخر سے مغرب کو ہمیشہ ہدف دشنام بناتا رہے۔ مستقبل کی اعلیٰ تہذیب وہ ہوگی جس میں مشرق کے بعض قدیم نصب العین مغرب کی کامیابیوں سے ہم آغوش رہینگے۔

محترمہ صغرا ہمایون مرزا

محترمہ صغرا ہمایون مرزا حیا حیدرآبادی خواتین میں ایک ممتاز حیثیت رکھتی ہیں۔ آپ شاعر ہیں، آپ نے کئی کتابیں تصنیف فرمائی ہیں اور متعدد زنانی رسائل کی مدیرہ رہ چکی ہیں۔ آجکل رسالۂ زیب النساء آپ کی اِدارت میں لاہور سے نکل رہا ہے۔ آپ ایک اچھی مقررہ بھی ہیں اور حیدرآباد کی اکثر زنانی و مردانی کانفرنسوں میں آپ سرگرم حصہ لیتی ہیں۔

آپ ۲۴ئہ میں اپنے مرحوم شوہر مسٹر ہمایون مرزا بیرسٹر کے ہمراہ سیاحت کی غرض سے یورپ تشریف لے گئی تھیں۔ اور دوسری مرتبہ ویمبلی نمائش کے وقت بھی آپ یورپ ہو آئی ہیں۔

اہل یورپ کی خصوصیات محترمہ صغرا ہمایون مرزا کے خیال میں یورپ کی ترقی کا راز یہ ہے کہ وہاں کے لوگ ہر چیز میں آگے بڑھنا چاہتے ہیں۔ اُن کے حوصلے بلند ہیں۔ وہ جس کام کو کرتے ہیں خلوص

اور محنت سے کرتے ہیں۔ وہ ایک دوسرے سے ہمدردی کرتے ہیں اور ملک و قوم کے لئے ہر قسم کے ایثار اور قربانی سے دریغ نہیں کرتے۔ برخلاف اس کے ہم لوگ کاہل ہیں۔ ہماری ہمتیں پست ہیں۔ ہم سمجھتے ہیں کہ جب ہم لَا اِلٰہَ اِلَّا اللہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللہ کہکر سیدھے جنت میں چلے جا سکتے ہیں تو ہمیں کسی اور کام کی ضرورت نہیں ہے۔ اس فرسودہ خیالی نے ہمیں تباہ و برباد کر رکھا ہے۔

اہل یورپ وقت کے بڑے پابند ہوتے ہیں اور وقت کو بیکار ضائع نہیں کرتے۔ حتیٰ کہ لنگڑے، لولے اور اپاہج سب ہی کام کرتے ہیں وہاں کے بیت المعذورین میں مختلف طریقوں سے ناکارہ لوگوں کو کام پر لگایا جاتا ہے

جرمنی میں غیر ملکی سیاحوں کے لئے ایک محکمہ قائم ہے جس کا کام سیاحوں کو ہر قسم کی سہولتیں بہم پہنچانا ہے۔ اس کی غرض و غایت یہ معلوم ہوتی ہے کہ سیاح وہاں سے اچھے اِرتسامات لیکر واپس جائیں تاکہ دور دور جرمنی کی شہرت پھیلے۔ اِس محکمہ میں یہ بتلا دینا کافی ہے کہ آپ جرمنی کی کونسی چیزیں دیکھنا چاہتے ہیں جس کے بعد ہفتہ میں دو دن اِس محکمہ کے صدر اور معتمد آپ کو ان مقامات کی سیر کو لیجاتے ہیں۔ آپ کی سواری اور خورد و نوش کا اِنتظام تک اس محکمہ کی جانب سے ہوتا ہے۔ محترمہ صغرا ہمایون مرزا نے اس محکمہ کے توسط سے بچوں کی تعلیم گاہیں، زچگی خانے اور اپاہج خانے دیکھے۔ آپ اس محکمہ کے لوگوں کے اخلاق اور برتاو کی بڑی تعریف فرماتی ہیں۔

یورپ اور ہندوستان کی عورتوں کا مقابلہ کرتے ہوئے آپ نے فرمایا کہ ہمارے پاس مسلمان عورتوں سے کچھ کام نہیں لیا جاتا۔ جب تک

مرد اور عورت مل کر کوئی کام نہیں کرینگے اس وقت تک ہمارا ترقی کرنا محال ہے۔
میرے اِس اعتراض پر کہ اس سے گھر کے اِنتظامات میں مشکلات پیدا ہونے کا اِحتمال ہے آپ نے فرمایا کہ اس میں شک نہیں کہ گھر کا کام کاج سب سے مقدم ہے لیکن کم از کم فرصت کے اوقات میں عورت اگر چاہے تو مرد کا بہت کچھ ہاتھ بٹا سکتی ہے۔ لیکن آجکل کی تعلیم یافتہ لڑکیوں کا یہ حال ہے کہ اُنھیں دعوتوں، تقاریب اور جلسوں میں تو شریک ہونا آتا ہے لیکن نہیں آتا ہے تو گھر کا کام کاج۔ اُمورِ خانہ داری سے اُنھیں دلچسپی نہیں۔ اور اس پر طرفہ یہ کہ انہیں فرصت بھی نہیں۔ خود اپنی غیر معمولی مصروفیت کا ذکر کرتے ہوئے محترمہ نے فرمایا کہ گھر کے جملہ اِنتظامات اور پریشانیوں کے بعد وہ مضامین لکھنے، تقاریر کرنے، کانفرنسوں اور جلسوں میں شریک ہونے کے لئے وقت نکالتی ہیں۔ آپ کے خیال کے بموجب انسان اگر کرنا چاہے تو بہت کچھ کر سکتا ہے۔ اس کے برعکس یورپ میں کام کا یہ عالم ہے کہ زچگی خانوں میں زچاؤں کو بھی بیکار نہیں چھوڑا جاتا۔ وہاں کے معذورین سے جو کام لیا جاتا ہے اس کو دیکھکر حیرت ہوتی ہے۔ اگر کسی کا ہاتھ نہیں ہے تو اسے پاؤں یا دانتوں سے لکھنا سکھایا جاتا ہے۔ کوئی گونگا بہرا ہو تو اسے باغبانی سکھائی جاتی ہے۔ جرمنی کے ایک بیت المعذورین میں آپ نے دیکھا کہ ایک کمرے میں اُن تمام اپاہجوں کی تصویریں آویزاں تھیں جنھوں نے باوجود بدترین جسمانی ناقابلیتوں کے کچھ نہ کچھ کام سیکھا اور اس میں ترقی کی۔ اس سے دوسرے اپاہجوں کی ہمت افزائی ہوتی ہے اور ان کے دلوں سے یہ خیال جاتا رہتا ہے کہ دنیا میں ان کی ہستی کسی مصرف ہی کی نہیں اور وہ سوسائٹی کے ناکارہ افراد ہیں۔

پردہ ہندوستان کی مسلمان عورتوں میں آجکل جس قسم کے پردے کا رواج ہے اس میں محترمہ صغرا ہمایوں مرزا ترمیم کی ضرورت محسوس کرتی ہیں اور آپ کا خیال ہے کہ ہماری عورتوں کو اسلامی پردہ اختیار کرنا چاہیئے جس سے زندگی کے کاروبار میں ہرج واقع نہ ہو۔ آپ بے پردگی کی حامی نہیں ہیں لیکن آپ چاہتی ہیں کہ عورتوں کا لباس ستر پوش ہو۔ اور عورتیں برقعہ ہی پہن کر کاروبار میں حصہ لیں۔

میرے اس سوال پر کہ ہماری عورتیں یورپ کی عورتوں کی کس حد تک اتباع کر سکتی ہیں آپ نے فرمایا کہ ہمیں ان کی اچھی اچھی چیزیں اختیار کرنی چاہیئے۔ یورپ کی سب ہی عورتیں بری نہیں ہیں۔ اچھے اور برے نمونے ہر ملک میں ہوتے ہیں اور ہم کو اچھوں کی تقلید کرنی چاہیئے۔ اس سلسلہ میں آپ نے اپنی کسی زمانہ کی ایک یوروپین پڑوسن مسز گھوش کا ذکر فرمایا جو باوجود ناتجربہ کار، جوان اور حسین ہونے کے اپنے شوہر کی اجازت کے بغیر گھر کے باہر قدم نہیں رکھتی تھی۔ وہ پردہ تو نہیں کرتی تھی لیکن کیا مجال کہ ملازم لڑکا کمرے میں گھس آئے یا شوہر کی عدم موجودگی میں اس کا کوئی دوست گھر آجائے۔ برخلاف اس کے ہمارا نیم پردہ ہمارے لئے خطرۂ جان بن گیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ عورت کی عصمت آبی کا امتحان اس کو گھر کی چار دیواری میں مقید رکھکر نہیں کیا جا سکتا۔ ایک جانور کو بھی باندھ کر رکھا جائے تو اس سے کوئی لغزش سرزد نہیں ہوگی۔ اصل آزمائش باہر پھرنے والیوں کے لئے ہے کہ باوجود موقعوں اور دلچسپیوں کے ان کے ہاتھ سے عصمت کا دامن نہیں چھوٹتا۔

خاتمہ آخر میں محترمہ صغرا ہمایون مرزا نے فرمایا کہ ہماری عورتوں کی غیر ترقی یافتہ

حالت کے مرد بھی بڑی حد تک ذمہ دار ہیں۔ خود مردوں کو چاہیئے کہ اپنی عورتوں کو کام پر لگائیں۔ اُن کو ایسے کام سکھلائیں کہ اپنی فرصت کے اوقات میں وہ مصروف رہ سکیں۔ اُن کو دنیا کے حالات سے باخبر رکھا جائے۔ اخبار بینی کی اُن میں عادت ڈالی جائے۔ اُن میں وطنیت کے جذبات پیدا کئے جائیں۔ ان میں وسیع النظری پیدا کی جائے تاکہ وہ شیعہ، سنی، ہندو، پارسی یا عیسائی کی تفریقوں کو نظر انداز کر کے قومی ترقی کا خیال رکھیں۔ ہماری ماؤں کو چاہیئے کہ گہوارہ ہی سے بچوں کے دلوں میں محبت اور صلح و آشتی کے بیج بوئیں تاکہ آئندہ چلکر جب یہ بیج تناور درختوں کی شکل اختیار کریں تو ہزار تفرقوں کی آندھیاں چلیں لیکن یہ اپنی جگہ سے جنبش نہ کر سکیں

مولوی میر اکبر علیخان صاحب

مولوی میر اکبر علی خاں صاحب بی۔ اے۔ ال۔ ال۔ بی آنرز (لندن) بیرسٹرایٹ لا ملک کے مشہور لیڈر اور جامعہ عثمانیہ کے قابل فخر سپوت ہیں۔ انجمن طیلسانین عثمانیہ کے صدر کی حیثیت سے آپ نے دو تین سال ملک کی اس نوجوان جماعت کی بہترین سرکردگی فرمائی ہے۔ آپ مجلس وضع قوانین سرکار عالی کے رکن اور مجلس بلدیہ کے نائب صدر رہ چکے ہیں۔ آپ اینگار کمیٹی کے بھی رکن ہیں جس کو حکومت سرکار عالی نے ملک کی سیاسی و دستوری اصلاحات کے متعلق سفارشات کرنے قائم فرمایا ہے۔

آپ کا قیام انگلستان میں ؁۲۵ تا ۲۸ء رہا۔

خصوصیات انگلستان کی سب سے پہلی چیز جو ایک نووارد کو متحیر کرتی ہے وہ لوگوں کی مصروفیت ہے۔ آپ کسی روز صبح کام کے اوقات شروع ہونے سے قبل سڑک پر نظر دوڑائیں تو اندازہ ہوگا کہ کس طرح ہر شخص اپنی دھن میں

لگا ہوا ہے اور وقت کے سیلاب کے ساتھ بہا جا رہا ہے۔ اس گڑبڑ اور نفسی نفسی میں جو چیز قابل تعریف ہے وہ لوگوں میں انتہائی ضبط اور نظم کا پایا جانا ہے۔ ادنیٰ سے ادنیٰ آدمی کو اپنے اور دوسروں کے حقوق اور ذمہ داریوں کا احساس ہے۔

ضبط و نظم

میرے اس سوال پر کہ اہل فرنگ میں اس ضبط و نظم کی کیا وجہ ہے اور یہ چیزیں ہم میں کیسے پیدا ہو سکتی ہیں مولوی اکبر علی خاں صاحب نے فرمایا کہ یہ چیزیں تعلیم سے زیادہ تربیت کا نتیجہ ہیں۔ ماحول اور گردوپیش کے حالات سے یہ عادتیں اتنی راسخ ہو گئی ہیں کہ اب یہ قومی خصوصیات میں داخل ہو گئی ہیں۔ اس کے برعکس ہمارے خیالات اور احساسات زبانی جمع و خرچ کی حد تک تو بہت اعلیٰ وارفع ہوتے ہیں لیکن عمل نہ ہونے کیوجہ سے ان کی حیثیت بالکل تصوری ہوتی ہے۔

ایثار

انگریزوں کے متعلق یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ وہ مجسم ایثار اور ہمدردی ہیں۔ اسکی توضیح آپ نے اپنے ایک معمولی تجربہ سے یوں فرمائی۔ آنرس کے آخری امتحان کے دو تین روز قبل آپ کا مزاج ناساز ہو گیا۔ آپ سخت متردد تھے کہ کیا ہوگا لیکن لینڈ لیڈی نے آپ کی تیمارداری اور دلدہی میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ وہ روزآنہ امتحان گاہ تک آپ کے ساتھ آتی اور پرچہ ختم ہونے تک باہر موٹر میں بیٹھی رہتی اور آپ کے لئے تھوڑے تھوڑے وقفوں سے میوہ جات اور کھانے کی دوسری ہلکی چیزیں بھیجتی رہتی۔ امتحان کے اختتام تک اس کا یہی حال تھا۔ بلکہ اُس نے اپنے شوہر سے بھی کہدیا تھا کہ اس نے اپنا سارا وقت مسٹر خان کے لئے وقف کر دیا ہے۔ برخلاف اس کے ہمارے پاس موقع و محل کا لحاظ نہیں کیا جاتا۔ جہاں ضرورت نہیں وہاں ہمدردی کا اتنا مظاہرہ ہوتا ہے کہ تکلیف ہونے لگتی ہے اور جہاں فی الواقع اس کی ضرورت

ہوتی ہے وہاں سرد مہری برتی جاتی ہے۔

ضبط و تحمل انگریزوں کے ضبط و تحمل کا اندازہ اس واقعہ سے ہو سکتا ہے۔ ایکمرتبہ مولوی اکبر علی خاں صاحب اپنی لینڈ لیڈی کے ہمراہ برائٹن تفریح کے لئے گئے اور اس عورت کے شوہر نے وہاں سیکل پر آنے کا وعدہ کیا۔ لیکن چالیس پچاس میل کا فاصلہ ہونے کیوجہ سے یہ شخص وہاں دیر سے پہنچا اور مقام متعینہ پر ان لوگوں کو منتظر نہیں پایا۔ علاوہ ازیں مجمع زیادہ ہونے کیوجہ سے ان کا پتہ بھی نہیں چل سکا۔ اس کو وہاں کسی ہوٹل میں ٹھہرنے بھی جگہ نہیں ملی۔ ناچار کوفت کھا کر وہ مکان واپس ہو گیا۔

دوسرے روز جب یہ لوگ واپس ہوئے تو راستہ میں ایک دوست کی زبانی اسکی پریشانیوں اور غصہ کا حال معلوم ہوا۔ مکان پہنچنے کے بعد بیوی نے اپنی غلطی کی معذرت چاہی۔ شوہر نے نیچی نظریں کئے ہوئے جواب دیا کہ آئندہ کے لئے احتیاط کی جائے اور سارا قصہ ختم ہو گیا ورنہ مولوی اکبر علی خاں صاحب دل میں ڈر رہے تھے کہ معلوم نہیں دونوں کی لڑائی کیا صورت اختیار کرتی۔

کمزوریاں انگلستان کے لوگوں میں بظاہر دو خامیاں نظر آتی ہیں۔ ایک جذبات کی کمی اور دوسرے عورتوں کے معاملات۔ اول الذکر محض کاروباری ذہنیت کا نتیجہ ہے جس نے لوگوں کو حد درجہ کاروباری بنا دیا ہے سرِ راہ ممکن ہے کسی اپاہج کو خیرات دیتے ہوئے لوگ پس و پیش کریں لیکن اس سے ہرگز یہ نتیجہ نہیں نکالا جا سکتا کہ ان میں خیرات کا تصور ہی نہیں ہے۔ اس معاملہ میں یہ لوگ ہم سے بھی زیادہ پابند ہیں لیکن انفرادی خیرات کے طریقوں کے مخالف ہیں۔

ملک میں بڑے بڑے خیراتی ادارے ہیں جہاں لوگ بڑی پابندی سے چندے ادا کرتے ہیں۔ اس طرح اجتماعی طور پر جو چندہ جمع ہوتا ہے وہ انفرادی چندوں سے اپنی افادیت میں بڑھا ہوا ہوتا ہے۔ معاشری خدمت گذاری کا جتنا احساس انگلستان میں ہے وہ کسی ملک میں نظر نہیں آتا۔ ملک میں ہزاروں ایسے ادارے ہیں جو محض عطیوں اور خیراتی رقوم پر چلتے ہیں جس سے انگریزوں کی بیدار مغزی ظاہر ہوتی ہے۔

یورپی عورتوں کے متعلق ہندوستان میں عجیب مبالغہ آمیز روایات مشہور ہیں۔ ہمارے اور اُن کے نقطۂ نگاہ میں فرق ہے۔ ہم جن چیزوں کو عیب سمجھتے ہیں وہاں وہ عیب نہیں ہیں۔ مثلاً ناچنے ہی کو لیجئے۔ ہم اس کو معیوب سمجھتے ہیں لیکن وہاں یہ بمنزلہ احتیاج کے ہے۔ یورپ میں پردہ نہ ہونے کیوجہ سے جسم کی وہ چیزیں جو چھپی رہنی چاہیں نمایاں ہو کر نظر آتی ہیں۔ لہٰذا ان کے معمولی عیوب بھی ہمیں بہت نمایاں ہو کر نظر آتے ہیں حالانکہ یورپ کے تمدنی اور معاشری حالات کے مدنظر یہ چیزیں قابل درگذر ہیں۔ عورتوں کے آزاد رہنے کیوجہ سے معاشرے میں جو خرابیاں پیدا ہو سکتی ہیں وہ اُن اچھائیوں سے ہزار درجہ بہتر ہیں جو عورتوں کو پردے میں رکھنے سے پیدا ہوتی ہیں۔ ہماری موجودہ چاردیواری کے پردے نے عورتوں کی جسمانی اور ذہنی نشو ونما کو تباہ کر دیا ہے۔ ان میں وسیع النظری اور بلند حوصلگی پیدا نہیں ہو سکتی اور اُن کی تمام صلاحیتیں اور قابلیتیں گھر کے انتظام اور بچوں کی نگہداشت میں صرف ہو کر رہ جاتی ہیں یا یوں ہی ضائع جاتی ہیں۔

مولوی محمد صلاح الدین صاحب

مولوی محمد صلاح الدین صاحب ایم-اے کا شمار جامعہ عثمانیہ کی بہترین پیداوار میں ہے۔ آپ نے آکسفورڈ میں پانچ سال قیام فرمایا ہے۔ فلسفہ آپ کا مضمون ہے لیکن انگریزی ادب سے آپ کو غیر معمولی دلچسپی اور لگاؤ ہے۔

آپ جامعہ عثمانیہ میں انگریزی و فلسفہ کے لکچرار ہیں۔

آپ کا قیام انگلستان میں سنہ ۲۵ تا ۳۱ء رہا۔

ابتدائی تعلیم پانچ سال کی عمر میں بچے لازمی طور پر کنڈرگارٹن میں شریک کئے جاتے ہیں جہاں تعلیم مفت دیجاتی ہے۔ یہاں بچوں کی تربیت اور کھیل کود کی طرف خاص طور پر توجہ کی جاتی ہے۔ ہر مہینہ ان کا طبی معائنہ ہوتا ہے اور خصوصیت سے ان کے دانت اور آنکھوں کا امتحان کیا جاتا ہے۔ بچوں کی تعلیم کے لئے بیمہ کا ایک بہت اچھا طریقہ رائج ہے۔ وہ یہ کہ ماہانہ چھ پنس (۹ ر) کی اقساط کی ادائی پر اکیس سال کی عمر میں وہ ڈھائی سو پونڈ بچوں کو یکمشت ملجاتے ہیں

اور یہ رقم اتنی کافی ہوتی ہے کہ اعلیٰ تعلیم پر یا کسی اور کام کے شروع کرنے میں اس سے بڑی مدد ملتی ہے۔

کنڈرگارٹن میں آٹھ نو سال کی عمر ختم کرنے کے بعد بچے ہائی اسکول میں شریک ہوتے ہیں۔ بچوں کی تعلیم میں خاص طور پر ان کے صنعتی میلانات کا لحاظ کیا جاتا ہے اور ان میں مشین اور اس کے کل پرزوں کے اعمال سے متعلق تجسس پیدا کرایا جاتا ہے۔ علاوہ ازیں اُنھیں مدرسہ کی جانب سے میوزیم، نمائش گھر اور اس قسم کے دوسرے مقامات کی باقاعدہ تفریح کرائی جاتی ہے تاکہ بچے اپنی فطری قابلیتوں کو نشوونما دے سکیں۔ شہنشاہی نمائش کے اس واقعہ سے اس کی مزید توضیح ہوسکتی ہے کہ نمائش سے متعلق انگلستان کے بچوں کے لئے ایک انعامی مضمون نویسی کا مقابلہ منعقد ہوا۔ جس لڑکے کا مضمون بہترین قرار پایا اس کو ملک معظم نے اپنے ہاتھوں سے انعام مرحمت فرمایا۔ اس نمائش سے متعلق یہ امر قابل ذکر ہے کہ اسمیں شہنشاہیت کے جملہ ممالک کی صنعت و حرفت، زراعت، پیداواریں اور دیگر اہم چیزوں کے نمونے فراہم کئے گئے تھے۔ انگلستان کی جملہ صنعتوں کی نمائش یہاں اس طور پر کی گئی تھی کہ اُن کی تیاری کے سارے مراحل از ابتدا تا انتہا بتلائے گئے تھے۔ مثلاً صنعت بسکٹ سازی میں گیہوں سے بسکٹ بننے تک جتنے مراتب ہوتے تھے اُن کو نمائش کا ہر ناظر دیکھ سکتا تھا۔

پبلک اسکول

پبلک اسکولوں کا انگلستان میں آجکل رواج کم ہوتا چلا ہے اور برنارڈ شا اور دیگر ماہرین تعلیم ان کی ضرورت محسوس نہیں کرتے۔ کسی زمانہ میں یہ تہذیب سکھلانے اور اوصاف حکمرانی پیدا کرنے کے

مخصوص ادارے تھے اور موجودہ صنعتی تعلیم کا ان پر کوئی اثر نہیں تھا۔ پبلک اسکول اور میٹرک کا نصاب اتنا معیاری ہوتا ہے کہ ان کے بعد طلبا، ہر قسم کے کاروبار میں شریک ہو سکتے ہیں۔ ہندوستانی طلباء کے لئے یہاں کے میٹرک کا نصاب بہت مشکل ہے۔

مخلوط تعلیم کنڈرگارٹن تک تعلیم مخلوط ہوتی ہے۔ ہائی اسکول تک زنانی اور مردانی مدارس ہیں۔ لیکن کالج میں پھر تعلیم مخلوط ہوجاتی ہے ہم تعلیمی کے نتائج کے متعلق مولوی صلاح الدین صاحب نے فرمایا کہ ملک کے معاشری حالات اس قسم کے ہیں کہ مخلوط تعلیم کی برائیوں کی طرف کوئی توجہ نہیں کی جاتی۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ تعلیم اور سوچنے سے اخلاقی معیارات میں تزلزل کا پیدا ہونا یقینی ہے۔ تعلیم حاصل کرنے کے بعد اخلاق کے پرانے اصول وضوابط کی پوری طرح پابندی ناممکن ہے کیونکہ جبتک اخلاقی معیارات موجودہ سوسائٹی کے تغیر پذیر حالات کا ساتھ نہ دیں عقل سلیم انہیں تسلیم نہیں کر سکتی۔

کتب خانے لوگوں میں ذوق مطالعہ پیدا کرنے کے لئے انگلستان میں مختلف طریقے رائج ہیں جن کے منجملہ ٹائمس بک کلب کا طریقہ ہمارے لئے قابل تقلید ہے۔ روزنامہ ٹائمس لندن کی جانب سے ہر شہر اور قصبہ میں ایک کلب قائم ہے جس کی رکنیت کا چندہ ۲/۱ شلنگ ماہانہ ہے اراکین کو ہر کتاب جس کی قیمت (۳۰) شلنگ سے زیادہ نہ ہو مطالعہ کے لئے فراہم کی جاتی ہے۔ فسانوی ادب پر عام طور پر زور دیا جاتا ہے۔

علاوہ ازیں ہر مقام پر بلدی کتب خانے قائم ہیں تا کہ ادنیٰ طبقہ کے لوگ

جو ماہانہ چندہ ادا نہیں کر سکتے ان سے استفادہ کر سکیں۔ لیکن اس کے رکن بننے کے لئے حدود بلدیہ میں رہنا ضروری ہے۔

کاروباری ذہنیت

انگلستان بالکلیہ ایک کاروباری ملک ہے۔ نپولین نے بجا طور پر انگریزوں کو دکانداروں کی قوم کا نام دیا ہے۔ کاروباری ذہنیت زندگی کے ہر شعبے میں سرایت کی ہوئی ہے جس کی وجہ سے انفرادیت پر اتنا زور دیا جاتا ہے کہ گھر کی زندگی تباہ ہو جاتی ہے۔ جہاں لڑکا کمانے لگا وہ اپنی دنیا الگ قائم کرنا چاہتا ہے۔ یہی حال لڑکیوں کا ہے۔ اس سے لازماً محبت اور خلوص میں کمی واقع ہو جاتی ہے اور یہ فطرت انسانی ہے کہ جہاں عقل و خرد میں اضافہ ہوا جذبات میں کمزوری پیدا ہونا ضروری ہے۔ یوں بھی سرد ملک ہونے کی وجہ سے لوگ زیادہ حساس نہیں ہوتے۔ اور کوئی چیز دائرۂ اعتدال سے متجاوز نہیں ہونے پاتی۔ چنانچہ انگلستان میں یہ ایک عام بات ہے کہ نوجوان عموماً قسمت آزمائی اور مہم جوئی کے لئے دور دراز کے ممالک کو نکل جاتے ہیں جس کا والدین ذرا بھی اثر نہیں لیتے بلکہ خوش ہوتے ہیں کہ لڑکا ٹھکانے لگ گیا اور اپنے پیروں پر کھڑا ہے۔ ہر چیز کو وہ لوگ افادی نقطۂ نظر سے دیکھتے ہیں۔ چنانچہ ہماری طرح وہاں کوئی شخص اپنے کسی عزیز کے پاس مہینوں مہمان نہیں رہتا۔ کرسمس یا خاص موقعوں پر اگر کسی عزیز کے پاس ٹھہرنا مقصود ہو تو بہت پہلے اس کی اطلاع دیدی جاتی ہے اور پھر قیام بھی دو چار روز سے زائد نہیں ہوتا۔ کاروباری ذہنیت کے علاوہ اس کی ایک اور بھی وجہ ہو سکتی ہے۔ وہ یہ کہ بلحاظ گنجائش مکانات مختصر اور رہائش کمروں کی تعداد سے زیادہ نہیں ہوتے۔ سردی اتنی سخت ہوتی ہے کہ کوئی شخص فرش پر سو نہیں سکتا

لہذا قبل از قبل اپنے قیام کے متعلق اطلاع دینی ضروری ہو جاتی ہے ورنہ کسی ہوٹل میں ٹھہرنا پڑتا ہے۔

نظم و باقاعدگی انگریز جتنے کاروباری ہیں اتنا ہی ان میں ضبط اور نظم بھی پایا جاتا ہے۔ انگریزوں کی باضابطگی اور تنظیم کا اندازہ ۱۹۲۶ء کی عام ہڑتال سے ہو سکتا ہے۔ ہڑتال کے زمانہ میں تین روز تک ہر قسم کا کاروبار بند تھا۔ شہر لندن پر اس قدر اُداسی چھا گئی تھی کہ معلوم ہوتا تھا کہ اُسے سانپ سونگھ گیا ہے۔ ہڑتال سے روزآنہ کروڑوں پونڈ کا نقصان ہو رہا تھا لیکن ملک میں کہیں بھی ایک فساد یا ہنگامہ رونما نہیں ہوا۔ اتنی زبردست اور انقلاب انگیز ہڑتال میں اتنی منظم کیفیت کا پیدا ہونا صرف انگلستان میں ممکن ہے۔ ہڑتال کے زمانہ کی یہ چیز قابل ذکر ہے کہ اکسفورڈ اور کیمبرج کے انڈر گریجویٹوں نے جہاز کے حمالوں اور قلیوں کی طرح کام کیا۔

انگریزوں کی تنظیم اور ڈسپلن کا اندازہ اس واقعہ سے بھی ہو سکتا ہے کہ عام ہڑتال کے بعد ہی انتخابات ہوئے اور عمالی حکومت قائم ہوئی۔ انگلستان میں انتخابات کے نتائج سینما مشین کے ذریعہ ایک بڑے اونچے پردے پر دکھلائے جاتے ہیں جس کے دیکھنے کے لئے لاکھوں آدمی جمع رہتے ہیں۔ مسٹر بالڈون کی شکست کا منظر جس طرح دکھلایا گیا اگر ہندوستان میں دکھلایا جاتا تو کشت و خون کی نوبت آجاتی۔ پردے پر مسٹر بالڈون کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے، ہچکیوں سے منہ میں پائپ ہل رہا تھا اور چہرے سے انتہائی شکست خوردگی کی علامات ظاہر تھیں لیکن قدامت پرستوں نے اور ہر شخص نے اس منظر کو بڑی خندہ پیشانی سے

دیکھا اور کسی کی پیشانی پر بل تک نہ آیا۔

وطن پروری اسیطرح انگریز دنیا میں زبردست قوم پرست ہیں۔ اپنے وطن کے لئے یہ ہر قسم کے ایثار کے لئے تیار ہیں۔ کسی غیر ملکی چیز کی طرف انگریز آنکھ اُٹھا کر نہیں دیکھتے۔ زمانۂ قیام اکسفورڈ میں محمد صلاح الدین صاحب روسی دیا سلائی خریدتے تھے لیکن جب سنہ ۲۶ء میں رُوس کے خلاف عام نفرت پیدا کی گئی تو کسی دکان پر یہ دیا سلائی نظر نہیں آتی تھی اور اُس کا نام لیجئے تو لوگ ناک بھوں چڑھاتے اور مشتبہ نظروں سے دیکھنے لگتے تھے۔ کمپنی کے صدر دفتر لندن سے استفسار کرنے پر معلوم ہوا کہ اکسفورڈ کی کوئی دکان اِس دیا سلائی کو اپنے پاس رکھنے آمادہ نہیں ہے۔ اسیطرح "عمالی ہفتہ وار" جو ایک اشتمالی اخبار تھا بجز دفتر اشاعت کے کسی نیوز ایجنٹ کے پاس دستیاب نہیں ہوتا تھا۔

عورت مولوی محمد صلاح الدین صاحب نے آزادیٔ نسواں کے متعلق اپنے خیالات کی بڑی دلچسپ توضیح فرمائی۔ آپ کا خیال ہے کہ جن حالات اور موقعوں سے ایک یوریین لڑکی کو سابقہ پڑتا ہے اگر وہی حالات اسی عمر کی ایک ہندوستانی لڑکی کے درپیش ہوں تو ضبط نفس میں یوریین لڑکی بازی لے جائیگی۔ وہاں لڑکیوں سے کھلے بندوں جنسی معاملات اور اس کے دلچسپ پہلوؤں پر تبادلۂ خیالات کرنا کوئی بات ہی نہیں اور اس سے کوئی خاص نتائج بھی پیدا نہیں ہوتے۔ یورپ میں تعلیم، آزاد خیالی اور مرد اور عورت کی معاشی یکسانیت نے عورتوں کو اپنی حد سے دو ایک قدم آگے بڑھا دیا ہے۔ آج کل ضبط تولید کے عجیب و غریب ایجادات اور طریقوں نے رہی سہی قید بھی اُٹھا دی۔ ضبط تولید کا انگلستان میں

کافی چرچا ہے۔ جبتک مالی حالت اچھی نہ ہو لوگ شادی نہیں کرتے اور شادی ہو جائے تو اس وقت تک اولاد پیدا کرنے کی کوشش نہیں کیجاتی جبتک کہ مالی حالت اولاد کی پرورش اور ان کی تعلیم و تربیت کی کفیل نہ ہو۔ لیکن بجز اونچے طبقوں کے ادنیٰ متوسط اور غریب لوگ ابھی اس تحریک کے اثر سے دور ہیں۔

یورپ کی عصمت فروشی ہندوستان کے لئے بڑا دلچسپ اور پامال موضوع ہے انگلستان میں تو فرانس کی طرح اس کی قانوناً اجازت نہیں ہے۔ فرانس میں پیشہ ور عورتوں کی باقاعدہ رجسٹری ہوتی ہے اور معائنہ طبی کے بعد اجازت نامے دیئے جاتے ہیں جو اُن کے "صحت مند" ہونے کی دلیل ہوتے ہیں۔ علاوہ ازیں محکمہ صحت کی جانب سے امراض متعدی کے روکنے کی خاص کوشش کی جاتی ہے۔ چنانچہ پیرس کے پیشاب خانوں میں ان امراض سے بچنے کی تدبیریں اعلان کی شکل میں شائع کی جاتی ہیں۔ حتیٰ کہ ڈاکٹروں کے نام تک درج کر دیئے جاتے ہیں تاکہ مریض فوراً رجوع ہو سکیں۔ انگلستان میں ایسا نہیں ہوتا۔ یہاں پر اگر کوئی عورت سڑک یا عام شاہراہ پر مردوں کو اپنی طرف راغب کرتے ہوئے نظر آئے تو پولس اُسے گرفتار کر لیتی ہے۔ لیکن اس کے باوجود انگلستان میں پیشہ ور عورتوں کی کثرت ہے اور اس کے لئے پیکڈلی رسل اسکوائر وغیرہ مشہور اکھاڑے ہیں جہاں سن رسیدہ عورتیں تک جن میں بمشکل جوانی کے دھندلے آثار رہتے ہیں بناؤ سنگھار کر کے مردوں کا پیچھا کرتی ہیں۔

عورت اور مرد کے اختلاط کے مظاہرے تفریح گاہوں پر بنک کی تعطیلات اور خصوصیت سے ایسٹر کی چھٹیوں میں دیکھنے میں آتے ہیں۔ ایسٹر کا زمانہ تو بڑی دلکشی کا حامل ہوتا ہے۔ بہار کی ابتداء کے دن ہوتے ہیں، مطلع صاف رہتا ہے اور آفتاب

اپنی پوری تانباکیوں کے ساتھ نکلنے لگتا ہے۔ ایک مرتبہ ایسٹر کے زمانہ میں مولوی صلاح الدین صاحب شیکسپیر کے وطن مالوف اسٹراٹفورڈ آن ایون گئے جہاں اس موسم میں خوش باشوں کا ایک میلہ لگا رہتا ہے۔ تفریح کرتے کرتے جب آپ ایک پگڈنڈی سے جنگل کی طرف نکلے تو کچھ دور جانے کے بعد آپ نے دیکھا کہ راستہ کے دونوں جانب مرد اور عورتوں کے جوڑے تھوڑی دور پر پڑے ہوئے عیش منا رہے ہیں۔ عجیب دلچسپ اور ہوشربا مناظر دیکھنے میں آئے لیکن نہ راستہ چلنے والوں کو اس کا احساس تھا اور نہ یار لوگوں کو اس کی پرواہ تھی گویا ایک حمام میں سب ہی برہنہ تھے۔

یورپ کی عورتوں کا جذبات انگیز لباس اور ان کی عریاں پسندی بھی ہم لوگوں کے لئے عجیب خیال آرائیوں کا مرقع ہے لیکن وہاں یہ چیزیں اتنی عام ہیں کہ جذبات کی برانگیختگی کے لئے اب کافی متصور نہیں ہوتیں۔ عام طور پر سمندر کے کنارے یا نہانے کے مقامات پر عریانی کے دلچسپ مناظر دیکھنے میں آتے ہیں۔ لیکن پبلک مقامات پر عورتوں کو برہنہ نہانے کی اجازت نہیں ہے مگر پھر بھی روزآنہ کے ملبوس سے نہانے کا لباس پہننے میں جو تفنہ لگتا ہے وہ نظر بازوں کے لئے بہت کچھ ہے۔

اکسفورڈ میں دریائے چرول (CHERWELL) پر ایک ایسا مقام ہے جہاں مرد برہنہ نہاتے ہیں۔ اس مقام کے اطراف ٹٹیاں لگی ہیں اور عورتوں کیلئے یہاں سے گذرنے کے لئے ایک دوسرا راستہ ہے۔ لیکن اس کے باوجود شریر لڑکیاں ٹٹیوں کے سوراخوں میں سے جھانکتی ہیں جس کی بجز جنسی کشش کے کوئی اور وجہ نہیں ہو سکتی۔

جہانتک ازدواجی زندگی کا تعلق ہے یہ کہا جاسکتا ہے کہ عورت اپنے مرد

احباب سے بے تکلف ملتی ہے اور اس کو وہاں کوئی خاص اہمیت نہیں دیجاتی لیکن جب یہ دوستی اعتدال کے دائرہ سے بڑھنے لگتی ہے تو شوہر کچھ قیود اور پابندیاں عائد کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اگر معاملہ یہیں رفع دفع نہ ہوجائے تو بعض وقت شرمناک نتائج کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

یورپ میں عصمت مآبی ہی دراصل عورت کو جانچنے کا معیار نہیں ہے۔ وہاں بے عصمتی سے زیادہ وطن فروشی، فریب دہی، بددیانتی اور اس قسم کی دوسری چیزیں معیوب ہیں۔

خصوصیات ذاتی انگریز بالطبع بہت خاموش قسم کے لوگ ہیں۔ بغیر متعارف ہوئے آپ سے گفتگو نہیں کریں گے اور کریں گے بھی تو عام چیزوں سے متعلق۔ موسم، سیاسیات، کھیل کود وغیرہ۔ اس معاملہ میں فرانسیسی انگریزوں کے بالکل متضاد ہیں۔ ایک سرسری ملاقات میں آپ اُن کے متعلق ساری باتوں سے واقف ہوجاسکتے ہیں لیکن ساتھ ہی ان کی طبیعت میں اشتعال بھی زیادہ ہے۔ معمولی معمولی باتوں پر اُلجھ جاتے ہیں۔

نسلی تعصب انگلستان میں ہندوستانیوں سے کافی تعصب برتا جاتا ہے اکثر ہوٹل، رستوران، بال روم ایسے ہیں جن کے دروازے رنگین اقوام کے لئے بند ہیں۔ لیکن یہ خیال رفتہ رفتہ ناپید ہوتا جارہا ہے۔ لندن میں بجز حبشیوں کے دیگر اقوام کے لوگوں کو ہوٹلوں اور دیگر پبلک مقامات پر آنے کی عام اجازت ہے۔

لیکن رنگ کا یہ تعصب سب سے زیادہ اڈنبرا میں موجود ہے جہاں خود ہندوستانی

اپنے آپ کو ذلیل کیا۔ وہاں کے بڑے ہوٹلوں میں ہندوستانی طالبعلم اپنے ساتھ معمولی قسم کی فاحشہ عورتوں کو لیجانے لگے جس سے ہوٹلوں کی نیک نامی پر برا اثر پڑنے لگا تو مجبوراً ہندوستانیوں کے لئے ان کے دروازے بند کردیئے گئے۔ اس پر بہت شور وشغب ہوا حتیٰ کہ مسٹر چیٹرجی ہائی کمشنر کو تحقیقات کے لئے اڈنبرا جانا پڑا۔

عام اخلاق اہل انگلستان کے عام اخلاق اور شائستگی کے متعلق محمد صلاح الدین صاحب نے ایک انتہائی دلچسپ اور سبق آموز واقعہ بیان فرمایا۔ ایک صبح آپ اکسفورڈ میں کارفاکس کے ایک بس اسٹانڈ پر بس کے انتظار میں کھڑے ہوئے تھے۔ برف پڑ رہی تھی اور بس کے آنے کا وقت قریب تھا اتنے میں ایک عورت اسٹانڈ کی طرف دوڑتی ہوئی نظر آئی۔ بس آرہی تھی۔ ہر شخص کی نظریں عورت پر تھیں لیکن ابھی وہ اسٹانڈ تک پہنچنے بھی نہ پائی تھی کہ اس کا پیر پھسل گیا اور وہ چت گر گئی اور اس کا لباس منہ تک الٹ گیا۔ اِس ہوشربا منظر کو وہاں کھڑے ہوئے ہر شخص نے دیکھا لیکن حیرت ہے کہ کسی کے چہرے پر ہنسی تو کجا خفیف سی مسکراہٹ تک نمودار نہیں ہوئی۔ حتیٰ کہ مجمع میں سے کسی نے اس کی دستگیری نہیں کی۔ عورت گھبرائی ہوئی اٹھی، اس نے اپنا لباس درست کیا اور آ کر بس میں بیٹھ گئی۔ لیکن یہاں بھی کسی کے چہرے سے یہ ظاہر نہیں ہوتا تھا کہ ابھی تھوڑی دیر پہلے ان کی نظروں کے سامنے کوئی غیر معمولی واقعہ پیش آیا ہے۔ انگریزوں میں یہ ضبط و تنظیم ان کی قومی خصوصیات میں سے ہے اور قوم کا ہر فرد خواہ وہ امیر ہو یا غریب ان چیزوں کی پابندی کرتا ہے۔

صحت و بیمہ اِنگلستان کے ہر قصبہ میں ایک پبلک ہسپتال ہوتا ہے جو

خانگی چندوں سے چلتا ہے۔ ماہانہ چار پنس ادا کرنے کے بعد ہر شخص اس کا رکن بن سکتا ہے علاوہ ازیں فیکٹریوں، اخباروں، دکانوں میں کام کرنے والے مزدوروں (بجز خانگی ملازمین) کی صحت کا بیمہ حکومت کی جانب سے کرایا جاتا ہے جس کی معمولی اقساط مقرر ہیں۔ اگر کوئی مزدور بیمار پڑے تو اس کو اپنے خاص ڈاکٹر کے پاس رجوع ہونا پڑتا ہے جس کو پہلے ہی سے اس کے علاج کے لئے نامزد کر دیا جاتا ہے۔ چونکہ پیٹنٹ دوائیں عام طور پر مہنگی ہوتی ہیں اس لئے ان ڈاکٹروں کے پاس اچھی قسم کی سستی دواؤں کی ایک فہرست رہتی ہے جن سے مزدوروں کا علاج کیا جاتا ہے۔ اِس طریقہ کو پینیل سسٹم کہتے ہیں۔

حضرت بندگانعالی کے متعلق ایک غلط خبر

عام طور پر انگریز اتنے مصروف ہوتے ہیں کہ اُنھیں بجز اپنے ملک کے حالات کے دوسرے ممالک کے حالات سے کوئی خاص دلچسپی نہیں ہوتی اور نہ ہی اُن کے معلومات اچھے ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ بعض وقت بے بنیاد خبریں اخباروں میں تک شایع ہو جاتی ہیں۔ ذیل کے واقعہ سے اسکی توضیح ہو سکتی ہے۔

برار کے مطالبہ اور لارڈ ریڈنگ کے مشہور خط کی اشاعت کے وقت برطانوی اخبارات میں حیدرآباد کو نمایاں جگہ حاصل تھی اور ہماری ریاست سے متعلق بڑی دلچسپ خبریں شایع ہوا کرتی تھیں۔ چنانچہ ایک اخبار نے یہ بتلایا کہ حضور بندگانعالی دنیا کے سب سے دولت مند انسان ہیں۔ یہانتک تو خیر کوئی بات نہ تھی لیکن ستم ظریفی کی اِنتہا ہو گئی جب ایک دوسرے اخبار نے یہ بے مزہ یا

خبر شایع کی کہ حضور پرنور کی اسپیشل ٹرین میں اتنا بڑا حقہ ہے جو انجن میں رکھا رہتا ہے، اور اس کا تعلق ایک نلی اور نیچے کے ذریعہ ہر ڈبہ سے ہے اور جس ڈبہ میں سے چاہو لے پی سکتے ہیں۔ اِس سے لوگوں کے معلومات کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ بجز چند ممبران پارلیمنٹ یا ہندوستان سے واپس شدہ وظیفہ یاب لوگوں کے ہندوستان سے کسی کو کوئی دلچسپی نہیں۔

عدم وقفیت

انگریزوں کی عدم وقفیت کی محمد صلاح الدین صاحب نے ایک اور مثال دی۔ ایک کتاب خانہ میں آپ نے بڑے اشتیاق سے ہندوستان سے متعلق ایک انگریز خاتون کی ایک تصنیف دیکھی جس کی اخبارات میں بڑی تعریف ہوئی تھی۔ لیکن اس کا پہلا یا دوسرا ورق الٹتے ہی آپ پر یہ جغرافی انکشاف ہوا کہ "بنارس جو بنگال کا ایک مشہور شہر ہے . . . . "

افغانی طالبعلم کا جھگڑا

آپس کے جھگڑوں اور فساد میں فریقین کو ایک دوسرے کے خلاف موقع دیا جاتا ہے۔ یہ نہیں کہ ایک کے مقابل دو چار کھڑے ہو گئے۔ اس کی توضیح محمد صلاح الدین صاحب نے اس واقعہ سے فرمائی۔ ایسٹ بورن ایک مشہور سمندری تفریح گاہ ہے جہاں یار باش لوگوں کا خوب مجمع رہتا ہے۔ ایک مرتبہ جامعہ اکسفورڈ کے ایک افغانی طالبعلم کا پاؤں چلتے چلتے پھسل گیا اور وہ ایک انگریز پر جا گرا جو کسی ہندوستانی فوج کا وظیفہ یاب کرنل تھا۔ کرنل صاحب کے منہ سے غصہ میں "ڈام انڈین" نکل گیا جس کے سنتے ہی جوشیلے افغانی نے زور سے ایک چانٹا رسید کیا۔ اور دونوں میں ہاتھا پائی ہونے لگی۔ بوڑھے اور جوان کی لڑائی تھی جو ایسے

مقام پر ہو رہی تھی جہاں بوڑھے کی قوم کے ہزاروں افراد جمع تھے۔ لیکن کسی نے بوڑھے کی دستگیری نہیں کی۔ اُس کی خیر اسی میں تھی کہ اپنی ہار مان لیتا یا صلح کر لیتا اور انگریزوں کی حکمت علی مشہور رہے۔ آخر چاء کی دعوت دیکر بوڑھے نے اس قصہ کو ختم کیا۔

ظالم مرد ایک مرتبہ محمد صلاح الدین صاحب ایک انگریز خاتون سے جو آپ سے متعارف تھی اشتراکیت کی اہمیت بیان کر رہے تھے۔ آپ نے سرمایہ داری کی مذمت کی، انگلستان کے مزدوروں کی ناگفتہ بہ حالت پر اظہار افسوس کیا اور ہندوستان کی مثال پیش کی کہ کس طرح یہاں آپس میں ہمدردی اور خلوص ہے۔ آخری جملہ پر یہ خاتون برہم ہو کر کہنے لگی کہ ہندوستانیوں میں اتنی ہمدردی کہاں سے آئی جب وہ گھر کے نوکروں کو مارنے اور گالیاں دینے کے عادی ہیں۔ آپ نے اس بیان کی تردید کی لیکن اس نے اصرار کیا اور اپنی ایک ہندوستانی شوہر والی سہیلی کا ذکر کیا جس نے اس کو یہ بات بتلائی تھی۔ بالآخر لاجواب ہو کر آپ کو خاموش ہو جانا پڑا۔

جس مکان میں محمد صلاح الدین صاحب قیام پذیر تھے اس میں ایک پٹھان طالبعلم بھی رہتے تھے۔ مالک مکان کی لڑکی جوان تھی اور اس کی ماں اور باپ متوسط سے کچھ اونچی عمر کے تھے۔ لڑکی کا باپ بڑا بذلہ گو اور باذاق آدمی تھا۔ ایک روز سب بیٹھے خوش گپیوں میں مصروف تھے کہ بوڑھے نے مذاق سے کہا کہ وہ اپنی بیوی بچوں حتیٰ کہ انگلستان سے بیزار آ گیا ہے اور اس کا ارادہ ہندوستان جاکر کسی دیسی عورت سے شادی کر لینے کا ہے۔ اس پر لڑکی نے برجستہ کہا کہ مسٹر خان کی تین بہنیں ناکتخدا ہیں۔ ان میں سے وہ کسی ایک سے شادی کر لے سکتا ہے۔ اس

جملہ پر خانصاحب مشتعل ہو گئے اور آستین چڑھانے لگے۔ محمد صلاح الدین صاحب نے انھیں اردو میں سمجھایا کہ یہ محض مذاق تھا۔ اس پر بگڑ بیٹھنا اپنا خود تمسخر کرانا ہے۔ بڑی دیر میں خانصاحب ٹھنڈے پڑے۔ حقیقت یہ ہے کہ لڑکی کی زبان سے جو جملہ ادا ہوا تھا وہ ایسا تھا کہ اِس پر انگلستان میں غصہ کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔ اس کی مزید توضیح محمد صلاح الدین صاحب نے انگلستان کے ایک واقعہ سے یوں فرمائی۔ ایک طالبعلم کالج میں شرکت کی غرض سے پروفیسر کے پاس گیا جس نے اس کے وطن، خاندان و دیگر حالات کے متعلق مختلف سوالات کئے اور آخر میں اس کو پہچان کر فرمایا کہ کسی زمانہ میں اس کی ماں سے اُن کی بڑی دوستی تھی اِس سے بڑھکر اشتعال کے لئے اور کیا بات ہو سکتی ہے لیکن لڑکا اس سے ذرا بھی برہم نہیں ہوا۔

اِظہارِ محبت ایک مرتبہ محمد صلاح الدین صاحب ایک لڑکی کے ہمراہ ایک میلہ میں تشریف لے گئے۔ بنجاروں (GYPSIES) کا ڈیرہ دیکھکر اس نے اپنی قسمت معلوم کرنے کی خواہش ظاہر کی آپ چونکہ ان چیزوں کے قائل نہیں ہیں آپ نے اِنکار کر دیا۔ آخر لڑکی اکیلے ہی ڈیرہ میں گئی اور آپ باہر کھڑے رہے۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ ہنستی ہوئی نکلی۔ آپ نے مذاقاً دریافت کیا کہ کہیں اِس کی شادی کے متعلق کوئی انکشاف تو نہیں ہوا۔ لڑکی نے ایک زور کا قہقہہ لگایا اور آپ کے کان کے قریب اپنا منہ لاکر کہنے لگی "ہاں! لیکن ایک کالے آدمی کے ساتھ"۔

دانت اِنگلستان میں ہندوستانیوں کے دانتوں کو بڑی قدر کی

نگاہوں سے دیکھا جاتا ہے کیونکہ وہاں اکثر لوگوں کے دانت خراب ہوتے ہیں اور پیوریا عام مرض ہے۔ ایک مرتبہ ایک نوجوان لڑکی نے جس کو اپنے دو دانت پیوریا کی وجہ نکلوا دینے پڑے تھے آپکے دانتوں کو دیکھکر کہا کہ دانت کی مضبوطی اور خوبصورتی شاید کالے رنگ کے ساتھ مخصوص ہے۔

گرمی ہندوستانیوں کے متعلق عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ وہ انگلستان کی گرمی متعلق محسوس نہیں کرتے کیونکہ ہندوستان کے (۱۱۵) یا (۱۲۰) درجہ کی حرارت کے مقابلہ میں یہاں پارہ (۹۰) سے اونچا نہیں جاتا۔ لیکن یہ خیال صحیح نہیں ہے۔ گرمی برابر محسوس ہوتی ہے اور ماہ آگست میں تو حبس ہونے لگتا ہے۔

ڈاکٹر محمد مقبول علی

ڈاکٹر محمد مقبول علی بی۔ اے۔ یل۔ آر۔ سی۔ پی، یم۔ آر۔ سی۔ یس (لندن)
جامعہ عثمانیہ کے پہلے طیلسانی ہیں جنھوں نے انگلستان سے طب کی
ڈگری حاصل کی۔ آپ سر رشتہ طبابت سرکار عالی میں سیول
سرجن ہیں۔

سنہ ۲۱ء میں آپ علیگڈھ میں زیر تعلیم تھے۔ جب رئیس الاحرار
مولانا محمد علی رح نے جامعہ ملیہ کی بنا ڈالی تو آپ اس میں شریک ہو گئے
اس طرح آپ کو مولانا کے بہت قریب رہنے کا موقع ملا ہے۔
تحریک خلافت کے زمانہ میں صوبہ سرحدی وصوبہ متوسط میں پروپگنڈے
کا کام آپ کے تفویض تھا۔

انگلستان میں آپ کا قیام سنہ ۲۶ء تا سنہ ۳۳ء رہا

تنظیم ابتدا میں جب ایک ہندوستانی طالبعلم انگلستان میں قدم رکھتا ہے تو اُس کی کیفیت بالکل ایک رنگروٹ کی سی رہتی ہے۔ اس کا ماحول نیا ہوتا ہے۔ اس کے لئے دنیا نئی ہوتی ہے اور ہر چیز نئی۔ اپنے گرد و پیش کے حالات سے واقف ہونے کے لئے اُسے کچھ مدت درکار ہوتی ہے۔ اپنے اس ابتدائی زمانہ میں ڈاکٹر صاحب کو جس چیز نے سب سے زیادہ حیرت میں ڈالا وہ بس اسٹانڈ کا ایک معمولی واقعہ ہے۔ موسلا دھار بارش ہو رہی تھی لیکن بس کے انتظار میں لوگ برساتیاں اوڑھے یا چھتری لگائے قطار (کیو) باندھے کھڑے تھے۔ تھوڑے تھوڑے وقفوں سے بس آتی تھی، کنڈکٹر خالی نشستوں کی تعداد بتلا دیتا تھا اور سلسلہ کے لحاظ سے اتنے ہی لوگ بس میں داخل ہو جاتے تھے۔ انگریزوں کی ترقی کی سب سے بڑی وجہ یہی ان کا ضبط و تنظیم ہے جو ان کی زندگی کی ہر چیز پر حاوی ہے۔

محنت کی قدر اسیطرح لوگ اصول کے بڑے پابند ہوتے ہیں، اوقات کی پابندی کرتے ہیں اور خوب محنت کرتے ہیں۔ کام کرنے کے شوق کا یہ عالم ہے کہ ہر ادنیٰ و اعلیٰ اپنے آپ کو کسی نہ کسی کام میں لگائے رکھتا ہے خواہ اس میں آمدنی کی کوئی صورت ہو یا نہو۔ اپنے ایک واقعہ کے ذریعہ ڈاکٹر صاحب نے اس کی یوں توضیح فرمائی۔ لندن کے جس ہسپتال میں آپ زیر تعلیم تھے وہاں دو ادھیڑ عمر کی نرسیں بیماروں کی پالکیاں اٹھایا کرتی تھیں اور آپریشن تھیٹر کی صفائی بھی ان ہی کے ذمہ تھی۔ یہ دونوں وقت کی بڑی پابند تھیں اور اپنا کام بہت ہی عمدگی سے انجام دیتی تھیں۔ ایک مرتبہ ڈاکٹر صاحب نے ایک ہمدردانہ لہجہ میں

ان کی غیر معمولی محنت کی ستائش کرتے ہوئے ان کا مشاہرہ دریافت فرمایا۔ لیکن آپ کو یہ سن کر تعجب ہوا کہ انھیں ہسپتال سے کسی قسم کا معاوضہ نہیں ملتا اور وہ جو بھی کام کرتی ہیں وہ محض شوق، وقت گذاری اور جذبۂ ایثار کے تحت کرتی ہیں۔

اسیطرح شاہ جارج پنجم آنجہانی کی ہمشیرہ کا بھی ایک واقعہ ہے جو لندن کے ایک بچوں کے ہسپتال میں بطور نرس کام کرتی تھیں۔ ابتداءً ہسپتال والوں نے اُن سے ایسا کام لیا جو اُن کے اعزاز کے لحاظ سے مناسب ہوسکتا تھا لیکن جب اس کا انھیں پتہ چل گیا تو اس کو اُنہوں نے منظور نہیں فرمایا اور دوسرے روز سے ایک نرس کی حقیقی خدمات انجام دینے لگیں جس میں فرش کا دھونا بھی داخل ہے۔ مذکورہ دو واقعات سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ انگلستان میں محنت کی کیسی قدر کیجاتی ہے اور کام سے لگے رہنے کے کیا معنی ہیں۔

ہسپتال شہر لندن میں بارہ پندرہ بڑے بڑے ہسپتال ہیں جہاں طبی تعلیم کا بھی انتظام ہے۔ یہ ہسپتال بالکلیہ چندوں اور عطیوں پر قائم ہیں جن سے انگریزوں کی بیدار مغزی ظاہر ہوتی ہے۔ حکومت کی جانب سے بھی کچھ رقمی امداد ملجاتی ہے جو بہت قلیل ہوتی ہے۔ ان ہسپتالوں میں جتنے ڈاکٹر کام کرتے ہیں انھیں کوئی تنخواہ نہیں دیجاتی۔ البتہ طبی جماعتوں کو پڑھانے کا برائے نام کچھ معاوضہ ملجاتا ہے۔ لیکن ہسپتال میں مفت کام کرنے کے یہ معنی نہیں کہ اُنھیں کچھ فائدہ پہنچتا ہی نہیں ان کی خانگی پریکٹس کا دارومدار اسی اعزازی خدمت پر ہے اور یہیں سے اُنہیں شہرت حاصل ہوتی ہے۔

ہر محلہ میں پینل پریکٹس کا طریقہ رائج ہے جس میں کم قیمت کی دواؤں سے

غربا کا علاج کیا جاتا ہے۔ یوں دیکھا جائے تو انگلستان میں ڈاکٹر بڑے مہنگے ہیں اُن سے ملنے کے لئے اوقات مقرر ہیں۔ مشورے کی فیس کم از کم دو پونڈ یا تیس روپیوں کے قریب ہوتی ہے۔

عورت یورپ کی عورتوں کے متعلق مشرق میں عجیب و غریب قصے مشہور ہیں حقیقت یہ ہے کہ وہاں عورتوں کو جن حالات سے دوچار ہونا پڑتا ہے اگر وہی بات ہندوستان میں پیدا ہو جائے تو یہاں حالات اور بھی بدتر ہو جائیں۔ یورپ میں باوجود اتنی آزادی کے آپ بغیر متعارف ہوئے کسی عورت سے ملاقات یا گفتگو نہیں کر سکتے۔ اکثر عورتوں سے باوجود شناسائی کے اِختلاط نہیں بڑھایا جا سکتا جبتک وہ خود اس پر رضامند نہوں۔ عورتیں عام طور پر خوش طبعی اور بذلہ سنجی کو بہت پسند کرتی ہیں اور ایسے لوگ عورتوں میں کافی مقبول رہتے ہیں۔ علاوہ ازین ہر اُس شخص کی قدر کی جاتی ہے جس میں کچھ نہ کچھ کمال ہو۔

فرانیسی عورتیں اخلاقی معیار میں انگریزی عورتوں سے بڑھی ہوئی ہیں۔ وہاں سرِراہ ہائیڈ پارک کے جیسے اختلاط کے مناظر دیکھنے میں نہیں آتے البتہ امریکہ کے خوش باشوں یا دیگر سیاحوں کے لئے عورتوں کا ایک خاص طبقہ موجود ہے۔

نسلی اِمتیاز اِنگلستان میں حاکم و محکوم اور کالے گورے کا بھی اِمتیاز کیا جاتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے برٹش میوزیم کے قریب ایک ہوٹل میں ایک نئے آنے والے حیدرآبادی صاحب کے لئے ایک کمرہ محفوظ کرایا لیکن جب ہوٹل کے مالک کو اُن کی قومیت معلوم ہوئی تو اس نے صاف اِنکار کر دیا۔ انگریزوں کی یہ خصوصیت ہے کہ کیسطرح اپنا کام نکالنے کی کوشش

کرتے ہیں لیکن جہاں اُن سے کوئی کام نکلنا ہو یا جب مساویانہ سلوک کا موقع آئے تو کترا جاتے ہیں۔

عام اخلاق انگلستان کے اعلیٰ طبقہ کے لوگ بہت ذی خُلق ہوتے ہیں۔ ہسپتال کا بڑے سے بڑا سرجن معمولی سے معمولی مریضوں کے ساتھ انتہائی خندہ پیشانی سے گفتگو کرتا ہے۔ مریضوں کے جوتے خود اپنے ہاتھوں سے اتارنے اور پہنانے میں بھی اسے عار نہیں ہوتا۔ اسیطرح چھوٹے درجہ کے لوگ بھی خلیق ہوتے ہیں لیکن ان میں متضاد مثالیں بھی ملجاتی ہیں۔ ایک مرتبہ ڈاکٹر صاحب کرائیڈن تشریف لے گئے اور سگریٹ پیتے ہوئے اس مقام کا گشت لگا رہے تھے جہاں پر ہوائی جہاز ٹھیرے ہوئے تھے آپ کو سگریٹ پیتا دیکھکر ایک معمولی قسم کے آدمی نے جو غالباً وہاں کا نگران تھا آپ سے مخاطب ہو کر کہا " جناب! اگر میں آپ کی جگہ ہوتا تو یہاں سگریٹ نہیں پیتا۔" ڈاکٹر صاحب فرماتے ہیں کہ آپ کو سگریٹ پینے سے منع کرنے کا اس سے بہتر اور موثر طریقہ کوئی نہیں ہو سکتا تھا۔ اس قسم کے اخلاق وہاں کی سوسائٹی میں عام طور پر برتے جاتے ہیں۔

جذبۂ ایثار انگریزوں میں ایثار و ہمدردی کا بھی بڑا مادہ ہے۔ اگر کوئی حادثہ ہو جائے یا کوئی شخص کسی تکلیف میں مبتلا ہو جائے تو لوگ ہر قسم کی مدد کے لئے تیار ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ خود ہندوستان کے مشہور قتل بادلا کے واقعہ سے اِس کی تصدیق ہوتی ہے کہ کس طرح دو انگریز عہدہ داروں نے اپنی جان کو خطرہ میں ڈالکر

باؤ لا کی دستگیری کی تھی - بہرکیف ہندوستان اور انگلستان کے حالات کا مقابلہ کرنے کے بعد یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہاں کتے کی جان کی جتنی قدر کی جاتی ہے اتنی یہاں انسان کی نہیں کی جاتی -

ڈاکٹر میر سیادت علیخان

(آکسن)
ڈاکٹر میر سیادت علی خان ایم - اے، پی - ایچ، ڈی، بی، سی، ال
بیرسٹرایٹ لا جامعہ عثمانیہ کی ایک بہترین پیداوار ہیں - آپ سررشتہ عدالت
سرکار عالی میں ناظم ضلع ہیں - اس کے قبل آپ جامعہ عثمانیہ کے شعبہ قانون
میں پروفیسر تھے - شرع شریف اور اصول فقہ آپ کے خاص مضامین ہیں
انگلستان میں آپ کا قیام ۱۹۲۶ء تا ۱۹۳۱ء رہا -

تنظیم یورپ کے عروج کا راز ڈاکٹر میر سیادت علی خاں کے نزدیک صرف ایک لفظ "تنظیم" میں مضمر ہے جو اہل یورپ کی زندگی کے ہر پہلو پر حاوی ہے - صرف ایک طریقہ "کیو" سے اہل فرنگ کی باقاعدگی، تنظیم اور فرض شناسی کا اندازہ ہو سکتا ہے - کسی سینما گھر، کسی تفریح گاہ اور اسیطرح کسی عام مقام پر کسی قسم کا شور یا ہنگامہ نظر نہیں آتا - لوگ قطاریں باندھے کھڑے رہتے ہیں اور باری باری سے ٹکٹ حاصل کرتے ہیں - ریل چھوٹ جائے، سینما دیکھنا نصیب نہ ہو، سیر و تفریح سے محروم ہو جائیں - لیکن "کیو" کی پابندی

لازم ہے۔ یہاں کی طرح نہیں کہ سینما دیکھنے جتنے لوگ جاتے ہیں وہ بیک وقت ٹکٹ خریدنے کی کوشش کرتے ہیں خواہ اس میں کسی کا دم کیوں نہ گھٹ جائے۔

کاروباری ذہنیت وقت کی پابندی، ایفائے عہد اور فرض شناسی وہاں کی زندگی کے عام اصول ہیں۔ صنعتی ملک ہونے کی وجہ سے لوگوں میں یہ عادتیں راسخ بھی ہوگئی ہیں۔ اس کاروباری ذہنیت کا یہ اثر ہے کہ لوگ بے حد خلیق، ہمدرد اور وسیع النظر ہیں۔ کسی معاملہ میں رواروی اور جلد بازی نظر نہیں آتی اور بڑے سے بڑے معاملہ میں لوگ کبھی الجھتے دکھائی نہیں دیتے۔ یہ چیزیں وہاں کے معمولی سے معمولی لوگوں میں پائی جاتی ہیں چنانچہ ایک مرتبہ ڈاکٹر صاحب برٹش میوزیم میں پانچ سات گھنٹے مطالعہ کرکے ایک بس اسٹانڈ کیطرف جارہے تھے۔ سامنے سے ایک بس (موٹر) آرہی تھی اور ڈاکٹر صاحب اس کے بیچ راستہ میں تھے۔ ڈرائیور ہارن پر ہارن بجارہا تھا۔ ڈاکٹر صاحب اس خیال میں تھے کہ وہ کھرنجہ (پیومنٹ) پر چل رہے ہیں لہذا انھوں نے ہارن پر کوئی توجہ نہیں کی۔ بالآخر بس بری طرح آپ کے سامنے آکر رکی اور اس کا مڈگارڈ آپ کی پتلون کو چاٹ کر رہ گیا اس وقت کہیں ڈاکٹر صاحب اپنے مراقبہ سے بیدار ہوئے۔ پریشانی میں ڈرائیور کی صورت پر جو آپ نے نظر ڈالی تو وہاں بجز مسکراہٹ کے کچھ نہ تھا۔

پابندی وقت وقت کی پابندی کا یہ عالم ہے کہ معمولی دودھ لانے والا روزآنہ صبح اپنے وقت پر اس پابندی سے آتا ہے کہ

آپ اس کو دیکھکر اپنی گھڑی کا وقت درست کر سکتے ہیں۔ اس سلسلہ میں ڈاکٹر صاحب نے ایک اور واقعہ بیان فرمایا۔ آپ کو حیدر آباد ہی سے رات میں سونے سے قبل پیالی بھر دودھ پینے کی عادت تھی۔ چنانچہ انگلستان پہنچنے کے بعد آپ نے اپنی لینڈ لیڈی کو اس کے متعلق ہدایت کر دی۔ لیکن اپنے پانچ سالہ قیام میں ڈاکٹر صاحب نے ایک مرتبہ بھی دودھ کو ناغہ نہیں پایا حالانکہ یہ واقعہ ہے کہ ہندوستان میں اتنی غیر معمولی پابندی تو ماں بہنوں سے بھی ممکن نہیں۔ انگلستان کے ادنیٰ ملازمین کے معیار کارکردگی، راست بازی اور فرض شناسی کو دیکھکر کہنا پڑتا ہے کہ وہاں محنت کتنی باعہارت ہے جس نے وہاں کی زندگی کو جنت بنا دیا ہے۔ برخلاف اس کے ہندوستان میں یہی چیز سب سے زیادہ تکلیف دہ ہے۔ یہاں تو معمولی ماماؤں کا ملنا محال ہے اور پھر ان کی نازبرداریاں — خدا کی پناہ!

تربیت اطفال تربیت اطفال کے سلسلہ میں ڈاکٹر صاحب نے فرمایا کہ مدرسہ میں تعلیم پانے والے چھوٹی عمر کے بچّوں کے عام معلومات اتنے وسیع ہوتے ہیں کہ حیرت ہوتی ہے۔ سائنس، ایجادات اور دوسری کارآمد چیزوں سے متعلق بچوں کو جو معلومات گھر میں کھیل کود کے دوران میں حاصل ہوتے ہیں وہ ہمارے پاس کے بڑی عمر کے سائنس پڑھنے والوں میں بھی نہیں پائے جاتے۔ اسیطرح ملک کی تاریخ، جغرافیہ، سیاست، انتخابات سائنس کے مبادی، ملک کی پیداوار، پھول، پودے اور پرندوں سے متعلق موٹی موٹی باتیں اور ان کے نام بچوں کی نوک زبان ہیں۔

ڈاکٹر صاحب آکسفورڈ کی ایک فیملی میں سات آٹھ ماہ سے مقیم تھے۔

کرسمس میں اپنی لینڈ لیڈی کے چودہ سالہ لڑکے کو آپ کچھ تحفہ دینا چاہتے تھے جو وہاں کا ایک عام طریقہ ہے۔ آپ نے اس لڑکے سے دریافت کیا کہ اُسے کونسی چیز دیجائے۔ ڈاکٹر صاحب کے اصرار کرنے پر اُس نے جواب دیا کہ اُسے صرف پانچ شلنگ دیئے جائیں کیونکہ اپنے وائرلس سٹ کے لئے جو خود اس نے تیار کیا ہے ایک پرزہ کی ضرورت ہے جس کی قیمت پانچ شلنگ ہے اور اس رقم کے دینے میں اس کی ماں کو ایک زمانہ سے تامل ہے۔ چنانچہ اس رقم سے اس لڑکے نے نہ صرف اپنا سٹ ہی مکمل کیا بلکہ گھر کے سب لوگ اِس عید کے موقع پر وائرلس سے لطف اندوز بھی ہوئے۔

عورت انگلستان کی عورتوں کے متعلق ڈاکٹر صاحب نے فرمایا کہ زندگی کی دوڑ میں یہ مرد کے دوش بدوش ہیں گھر کا انتظام کفایت شعاری اور سلیقہ ان کے فرائض کے اہم جزو ہیں۔ شوہر کی آسائش کے معاملہ میں بھی مغربی عورت ہمارے معیار تہذیب پر پوری اُترتی ہے۔ البتہ وفاداری اور عصمت مآبی کے متعلق ان کا تصور کچھ ہم سے مختلف ہے۔ لیکن مغرب کی ہر عورت کے متعلق عمومیت سے اس نظریہ کا اطلاق نہیں کیا جاسکتا۔ اچھے اور برے نمونے ہر ملک میں پائے جاتے ہیں۔ تربیت، ماحول، معاشی واقتصادی حالات اور خاندانی شرافت کا بھی اخلاق پر بڑا اثر پڑتا ہے۔

عورت کی حیثیت قانونی اِنگلستان میں ایک زمانہ وہ تھا کہ عورتوں کو مردوں کے مقابلہ میں کسی قسم کے حقوق حاصل نہیں تھے لیکن لارڈ برکن ہیڈ ایکٹ کے بعد سے عورت کی

حیثیت قانونی میں بڑا اضافہ ہوگیا ہے۔ انگلستان میں شادی نہ صرف مذہبی بندھن ہے بلکہ دیوانی معاہدہ بھی۔ قوانین شادی اچھے ہیں اور شوہر بیوی کے حقوق و فرائض متعین ہیں۔ لیکن طلاق کے معاملہ میں اب بھی فریقین کو بڑی مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ عام طور پر طبیعتوں کا اختلاف، شوہر کا ظلم اور زیادتی، بیوی کا بانجھپن یا خرابی صحت حصولِ طلاق کے لئے کافی وجوہات تسلیم نہیں کئے جاتے۔ طلاق کے لئے زنا کا ثابت کرنا ضروری ہے۔ یہاں یہ امر قابل ذکر ہے کہ طلاق حاصل کرنے کے بعد بیوی نہ صرف شوہر سے اپنا نفقہ حاصل کرتی ہے بلکہ اپنے نکاح ثانی کے بعد بھی وہ نفقہ کی حقدار ہوتی ہے۔

وصیّت

وصیّت کے معاملہ میں بھی موصی پر کوئی قانونی تحدید نہیں ہے وہ جتنی چاہے جائداد وصیّت کے ذریعہ منتقل کر سکتا ہے۔ لیکن قابل تعریف بات یہ ہے کہ وصیّت کرنا لوگوں کی عادت میں داخل ہوگیا ہے۔ شرع شریف میں بھی اپنے اعمال کی خامیوں کو وصیّت کے ذریعہ پورا کرنے کا حکم ہے لیکن انگلستان میں حقیقی معنوں میں اس حکم کا منشا پورا ہوتا ہے۔ ہمارے پاس عام طور پر جیتے جی وصیّت کرنا معیوب سمجھا جاتا ہے اور جبتک موت سر پر نہیں پہنچ جاتی وصیّت کی طرف ذہن بھی منتقل نہیں ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ وصیّت کرنے کا موقع بالعموم ہاتھ سے نکل جاتا ہے۔ وصیت کی طرح وہاں ہر شخص عادتاً اپنی زندگی کا بیمہ بھی کراتا ہے۔

قومی خصوصیات

اس میں شک نہیں کہ اسلامی یا مشرقی نقطہ نظر سے یورپ اور انگلستان کی اخلاقی حالت پست ہے۔ شراب خواری

عصمت فروشی اور اس قسم کے دوسرے عیوب وہاں بکثرت پائے جاتے ہیں لیکن اس کے باوجود اہل فرنگ میں بعض قومی خصوصیات ایسی موجود ہیں کہ ان کی برائیوں پر پردہ پڑ جاتا ہے۔

عروج کے انتہائی نقطہ پر پہنچنے کے بعد ممکن ہے مسلمانوں کی پستی اور نکبت کا سبب بنی عباس اور بنی امیہ یا دیگر قبائل کے خاندانی مناقشات و باہمی منافرت ہو لیکن سب سے زیادہ مسلمان حکمرانوں کو جس چیز نے تباہ کیا وہ انکی عیش پرستی تھی اور اس میں بھی ان لوگوں نے اتنا غلو کیا کہ امور سلطنت کو پس پشت ڈال دیا۔ جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا جو ہم دیکھ رہے ہیں۔ یورپ کی حالت اس کے بالکل برعکس ہے۔ باوجود اس کے کہ یورپ میں شراب خواری و عصمت فروشی کی کثرت ہے لیکن لوگ اصول کے اتنے پابند ہیں کہ ہر کام وقت پر کرتے ہیں۔ دن بھر کے کام کاج کے بعد لوگ رات میں خوب عیش مناتے ہیں اور یورپ میں ان کے بے حد مواقع بھی حاصل ہیں لیکن صبح دیکھئے وہ اپنے کام پر برابر حاضر ہیں اور اپنا کام اس مستعدی اور دلجمعی سے انجام دیتے ہیں کہ اس وقت ان کے دماغ میں عیش کا کوئی تصور بھی نہیں ہوتا۔

ڈاکٹر یوسف حسین خان

ڈاکٹر یوسف حسین خان بی۔ لٹ (پیرس) جامعہ عثمانیہ میں تاریخ ہند کے استاد ہیں۔ آپ نے جامعہ ملیہ دہلی سے اپنا طیلسان حاصل کیا ہے۔ ایک مورخ، ادیب اور مقرر کی حیثیت سے آپ بے حد مشہور ہیں۔ آپ کی انگریزی کتاب "نظام الملک آصف اول" تاریخی نقطہ نظر سے حضرت آصف اول کی بہترین سوانح ہے۔

آپ کا قیام فرانس میں ۲۶ء تا ۳۱ء رہا۔

یورپ کی برتری کے اسباب

ڈاکٹر یوسف حسین خان کا ذاتی خیال یہ ہے کہ کسی قوم کی برتری کے دو اسباب ہوتے ہیں:۔ (۱) خود اس قوم کی اجتماعی تنظیم (۲) اس قوم کی وہ صلاحیت جو کائنات اور فطرت کو تسخیر کرنے کے لئے بروئے کار لائی جاتی ہے۔ باوجود اپنی کمزوریوں کے یورپ کا نظام اجتماعی دنیا کے دوسرے نظامات اجتماعی سے برتر ہے اور اس کا اصل اصول حریت ـــــ انفرادی حریت ہے۔ ازمنہ وسطہ کی تاریکی سے نکلنے کے

بعد یہی آزادی اور حریت تھی جس کی بدولت اہل یورپ کے دماغ روشن ہوئے، رسوم اور توہمات کی بیڑیاں اسی کی دھار سے کاٹی گئیں اور فلسفہ اور سائنس کے حقائق اسی کی بدولت دنیا کے سامنے بے نقاب ہوئے۔ یہ آزادی سیاسی آزادی نہیں بلکہ عقل انسانی کی آزادی ہے جس سے اہل یورپ نے ایک بہتر اجتماعی تنظیم کی داغ بیل ڈالی جس میں مساوات، عدل و انصاف اور ہر اس شخص کو جو صلاحیت رکھتا ہو اپنی صلاحیتوں کو کام میں لانے کا موقع دیا گیا۔ چنانچہ مغربی یورپ میں پچھلے تین سو سال میں صدہا ایسی مثالیں ملینگی کہ ادنیٰ بلکہ اسفل طبقہ کے لوگوں نے علم طب، فلسفہ، ادب اور دیگر میدانوں میں دوسروں کی رہنمائی کی ہے۔ اور ظاہر ہے کہ یہ موقع افراد کو اسی وقت ملتا ہے جب ان کی اجتماعی تنظیم کا محرک عدل و مساوات ہو۔ مسلمانوں نے دنیا کو جو تمدن دیا تھا اس کی خصوصیات بھی ان کی اجتماعی تنظیم کی برتری تھی جس کی وجہ سے افراد کو اپنی قابلیت چمکانے کا موقع ملتا تھا اور وہ قوم اور ملک کا بڑے سے بڑا کام کر سکتے تھے۔ اسی اجتماعی تنظیم کے بگڑنے سے انہیں زوال آیا اور علم و فن کی مشعل ان کے ہاتھوں سے نکلکر دوسروں کے ہاتھوں میں چلی گئی جو اب ہماری رہنمائی کر رہی ہے۔ باوجود اس کے کہ پورے طور پر مساوات کلی یورپ میں بھی موجود نہیں ہے لیکن کم از کم فرانس اور انگلستان میں اس کا امکان ہے کہ ایک ادنیٰ طبقہ کا فرد اگر اس میں صلاحیت ہے تو وہ وزیر اعظم تک بن سکتا ہے۔ بغیر اس اجتماعی تنظیم کے انفرادی قابلیت بروئے کار نہیں آتی کیونکہ اس کے چشمے گھٹ کر رہ جاتے ہیں اور ان کو فروغ دینے والے محرکات فنا ہو جاتے ہیں۔

یورپ کی برتری کا دوسرا سبب تسخیر فطرت کی صلاحیت ہے گذشتہ دو تین سو سال میں سائنس نے یورپ میں خاص اہمیت حاصل کی ہے اور اس کی ابتدا وہاں سے کی گئی جہاں پر کہ مسلمانوں نے اس کو اپنے عروج کے زمانہ میں لا کر چھوڑا تھا۔ یہ دراصل اجتماعی قابلیت ہے کہ فطرت کے رازہائے سربستہ معلوم کرکے اور ان پر قابو پاکر انہیں اپنے فروغ کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔ اعلیٰ اجتماعی زندگی کا یہ خاصہ ہے کہ وہ نہ صرف تمدن کو بہتر اور اعلیٰ بناتی ہے بلکہ اس کے ساتھ ساتھ علم اور فن کے پوشیدہ رازوں کو بھی آشکار کرتی ہے اور فطرت کے یہی راز ہائے سربستہ جب اجتماعی ملک بن جاتے ہیں تو بجائے خود تمدن کو فروغ دیتے ہیں۔ گویا دونوں ایک دوسرے کے لئے لازم و ملزوم ہیں۔ اہل یورپ کی نظم و ترتیب اور ضبط اجتماعی کا یہ ایک بڑا کارنامہ ہے کہ اس نے افراد کو اس لئے کہ فرد ہی دراصل زندگی میں سب کچھ ہے اور جماعت بھی اس کے بغیر کچھ نہیں، آزاد کیا اور جب ذہن انسانی آزاد ہے تو وہ لامتناہی ہے۔ فطرت کا کوئی راز اس سے بچ کر نہیں نکل سکتا۔ وہ فطرت کو اسی طرح اپنا غلام بنا لیتا ہے جس طرح ادنیٰ تمدنوں میں انسان اپنے ہم جنسوں کو غلام بناتے ہیں بجائے اس کے کہ آدمی اس کی گاڑی کو کھینچیں وہ فطری قوت سے اپنی گاڑی کھچواتا ہے۔

یورپ کی سائنٹفک ترقی جس کے مظاہرے سے ہم اس قدر مرعوب ہیں وہ دراصل ذہن انسانی کی آزادی کا نتیجہ ہے۔ سائنس کے مظاہر کو تباہی کے لئے بھی اور تمدن کی ترقی کے لئے بھی استعمال کیا جا سکتا ہے کیونکہ بجائے خود

علوم طبیعیہ کا مقصد یہی ہے کہ فطرت پر انسان کی گرفت اور قابو کو مستحکم کیا جائے اور ظاہر ہے کہ یہ نہایت شاندار اور نہایت ہی قابل قدر مقصد ہے کیونکہ اس کے مد نظر انسانی فلاح و بہبود ہے۔ لیکن اگر انسان چاہیں تو ان ہی مظاہر کو ایک دوسرے کی تباہی کے لئے بھی استعمال کر سکتے ہیں جیسا جنگِ عظیم میں ہوا لیکن یہ سائنس کا قصور نہیں بلکہ نفس انسانی کا قصور ہے جو سائنس کو اعلیٰ مقاصد کی بجائے ادنیٰ مقاصد کے لئے اِستعمال کرتا ہے۔ غرض یہ ذہن انسانی کی کار فرمائی ہے کہ آج ہمیں زمین، پانی اور ہوا پر انسانی تسلط نظر آ رہا ہے اور انسان کی یہی وہ قوت ہے جس نے پہاڑوں کے جگر شق کر دیئے، سمندروں کو عبور کیا اور بُعد زمانی و مکانی کو تابع کیا۔

ترقی کا مفہوم میرے اس سوال پر کہ آیا ہمارے نظام معاشرت میں کوئی ایسی خامیاں ہیں کہ ہم ان کی وجہ سے ترقی نہیں کر سکتے اور کیا اہل یورپ کی خانگی اور اخلاقی زندگی خصوصاً عورتوں کی آزادی بعض لوگوں کے نزدیک انسانیت پر ایک بدنما داغ ہے ڈاکٹر یوسف حسین خاں نے فرمایا کہ ترقی اور عروج نتیجہ ہیں قوموں کی بعض خوبیوں کا۔ جس طرح ایک کیمیائی تحلیل سے ایک خاص نتیجہ پیدا ہونا لازمی ہے اسیطرح تاریخ کا بھی ایک مفروضہ ہے کہ جب کسی قوم میں بعض خاص خصوصیات پیدا ہو جائیں تو اس کا ترقی کرنا ایک ضروری امر ہے۔ جنگ عظیم نے جرمنی کے پرخچے اڑا دیئے تھے، معاہدہ ورسائی نے اسے اِتنا بے دست و پا اور بے سر و سامان کر دیا تھا کہ صدیوں جرمنی کی ترقی کا امکان نظر نہیں آتا تھا۔ لیکن زمانہ نے دیکھ لیا اور تاریخ نے اِس واقعہ کو

محفوظ کر لیا کہ اس کسمپرسی کے عالم میں بھی جرمنی نے وہ قوت بہم پہنچائی کہ سارا اس کے قبضہ میں آگیا اور رھین لینڈ پر اس نے اپنا تسلط جما لیا اور دنیا کی کوئی طاقت اس کو اپنے ارادے سے باز نہ رکھ سکی۔ یورپ کی چھوٹی چھوٹی حکومتیں جو رتبہ میں حیدرآباد سے بھی کم ہیں، اپنے اندر اتنا ضبط و ترتیب رکھتی ہیں کہ بڑی سی بڑی حکومت ان کی طرف آنکھ اُٹھا کر نہیں دیکھ سکتی۔

عورت جہانتک اخلاقی کمزوریوں کا تعلق ہے یہ کہا جا سکتا ہے کہ دنیا کے سارے ممالک کا یہی حال ہے۔ فرق اتنا ہے کہ یورپ کی عورتیں آزاد ہونے کی وجہ سے ان کی آزادیاں نمایاں ہیں اور ہماری عورتیں مقید ہونے کی وجہ سے ہماری برائیاں پس پردہ ہیں۔ کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ کچھ دنوں قبل لکھنو اور دِلّی کے امرا کی اولاد تہذیب اور شائستگی سیکھنے کے لئے رنڈیوں کے پاس بھیجی جاتی تھی اور کیا اس زمانہ کا یہ فیشن نہیں تھا کہ ہر امیر کے گھر ایک طوائف ہوتی تھی اور کیا اب یہ چیزیں ہماری سوسائٹی میں موجود نہیں ہیں۔ یورپ کی اور ہماری عورتوں میں فرق اتنا ہے کہ وہاں کی عورتیں آزاد رہکر اپنی عصمت کی حفاظت کرتی ہیں اور ہماری عورتیں چار دیواری میں مقید رہ کر عفت مآب کہلاتی ہیں۔ اور اس کو ایک بڑا کارنامہ سمجھا جاتا ہے۔

ترقی کے وسائل میرے اس سوال پر کہ ہمیں ترقی کرنے کے لئے کونسے وسائل اختیار کرنے چاہئیں ڈاکٹر صاحب نے فرمایا کہ اس وقت ہمارا نظام معاشرہ جن اُصولوں پر قائم ہے وہ ہماری ترقّی کے لئے کافی ہے البتہ کچھ عقل اور بصیرت سے کام لینے کی ضرورت ہے۔ جبتک ہم

نظم و ترتیب اور سائنٹفک ترقی میں یورپ کے ہم پلہ نہ ہو جائیں اس وقت تک ہم اس کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ جب ہم میں یہ قوتیں پیدا ہو جائینگی تو اس وقت عقل کا عقل سے، سیاست کا سیاست سے، علم کا علم سے۔ غرض تمدن کا تمدن سے مقابلہ ہوگا اور اس میں جو بہتر ہوگا وہی دنیا میں برقرار رہیگا۔ اس وقت یورپ ہر معاملہ میں ہم سے برتر و اعلیٰ ہے۔ کیا یہ واقعہ نہیں کہ یورپ نے ہماری ہی چیزوں کو لیکر اُن میں اتنی ترقی کی ہے کہ ہم اس کی طرف اپنا دست سوال دراز کرنے پر مجبور رہیں۔ سنسکرت کی سب سے بہترین اور مستند لغت ایک جرمن نے لکھی ہے، عربی، فارسی اور مشرقی علوم کے گہوارے یورپ کی جامعات ہیں۔ کیا ان حقائق سے انکار کیا جا سکتا ہے۔

فرانسیسی قوم کی خصوصیات

فرانسیسی یورپ کا رند مشہور ہے اور اس میں رند کی تمام خصوصیات اچھائیاں اور برائیاں بدرجہ اتم موجود ہیں۔ لیکن ڈاکٹر صاحب نے کم از کم اپنے زمانۂ قیام میں وہ نقشہ نہیں دیکھا جو رند کے لفظ کے ساتھ ذہن انسانی میں پیدا ہوتا ہے۔ آپ کے ایک فرانسیسی پروفیسر نے فرمایا تھا کہ پیرس کی سڑکوں پر جو لوگ بدمست نظر آتے ہیں ان میں فرانسیسی بہت کم ہوتے ہیں۔ اس کی تصدیق بلدیہ فرانس کے اعداد و شمار سے بھی کرائی گئی کہ ان لوگوں کی (۹۵) فیصد تعداد امریکن، انگریز، جرمن، ایطالوی اور دیگر لوگوں پر مشتمل ہوتی ہے۔ خود ڈاکٹر صاحب کا تجربہ ہے کہ فرانسیسی نہایت معتدل طبیعت رکھنے والے لوگ ہیں جس طرح ان کے ملک میں ایک خاص قسم کی موزونی اور اعتدال ہے اُسیطرح

ان کے مزاج کی بھی یہی کیفیت ہے۔ ان کے ملک کے پہاڑ اور دریا نہایت متناسب اور خوبصورت ہیں۔ فطرت نے کہیں مبالغہ نہیں کیا۔ اسیطرح ان کے مزاجوں میں بھی مبالغہ نہیں ہے۔ یہ لوگ شراب بھی پیتے ہیں، رقص وسرود میں بھی حصہ لیتے ہیں اور زندگی کے دوسرے لطف بھی حاصل کرتے ہیں لیکن نہایت اعتدال کے ساتھ۔ ایک اوسط درجہ کے فرانسیسی کی خانگی زندگی اپنے اندر ایک نہایت موزونیت لئے ہوئے ہوتی ہے۔ چنانچہ کہا جاتا ہے کہ پیرس کے اوسط طبقے کی عورتیں جس قدر سلیقہ کے ساتھ لباس پہنتی ہیں وہ سلیقہ انگلستان کے طبقۂ اعلیٰ کی عورتوں کو بھی نصیب نہیں ہے اور اس سلیقہ کو سیکھنے کے لئے وہ فرانس آتی ہیں۔ ان کا کھانا سستا، اچھا اور لذیذ ہوتا ہے اور اس میں ایک طرح کی ایشیائیت پائی جاتی ہے اور ایشیا والوں کو اپنے اور ان کے کھانوں میں زیادہ فرق محسوس نہیں ہوتا۔

فرانسیسی بڑے منطقی لوگ ہوتے ہیں۔ ان کی بہت سی ناکامیاں ان کی اس کمزوری کے باعث ہیں۔ بقول برناڈشا جب فرانسیسی جمہوریت کا قائل ہوتا ہے تو اس کا فرض ہوجاتا ہے کہ سب سے پہلے اپنے بادشاہ کا سر کاٹے لیکن جب انگریز قائل ہوتا ہے تو وہ بادشاہ کو تخت پر برقرار رکھکر جمہوریت قائم کرتا ہے۔ فرانسیسوں کے فلسفہ اور ادب میں بھی اسی منطقیت کی جھلک نظر آتی ہے۔ یہ دراصل ان کے ذہن کی ایک تجریدی عادت ہے جس طرح ریاضی میں دو اور دو چار ہوتے ہیں اسیطرح وہ زندگی میں بھی دو اور دو کو چار دیکھنا چاہتے ہیں جو ممکن ہی نہیں۔ اور یہیں انھیں ناکامی سے

سابقہ پڑتا ہے۔ انگریزوں نے بالخصوص فرانسیسوں پر سیاست میں جو فوقیت حاصل کی ہے وہ دراصل ان کی غیر منطقیت کی وجہ ہے۔

فرانسیسی طبعاً خوش مزاج واقع ہوا ہے۔ وہ کبھی یاس مشرب نہیں ہو سکتا۔ وہ زندگی کو ہمیشہ روشن دیکھنا چاہتا ہے اور امید کی جھلک ہمیشہ اس کی آنکھوں کے سامنے رہتی ہے۔

فرانسیسی بہت جلد بے تکلف ہو جانے والا شخص ہے۔ آپ سے پہلی ملاقات میں وہ آپ کے خاندان بیوی بچوں اور آپ کی ساری دنیا کی چیزیں معلوم کرنے کی کوشش کریگا اور اپنی بھی چیزیں بیان کرتا جائیگا کیونکہ اسکا دل انسانی ہمدردی سے گرم ہے اور جب وہ کسی سے ملتا ہے تو کھل کر ملتا ہے۔ کسی قسم کے تکلفات اس کے دماغ میں نہیں ہوتے وہ کم آمیزی اور دیر آشنائی کو پسند نہیں کرتا۔ برخلاف اس کے انگریز سے اگر آپ کئی سال کی ملاقات رکھتے ہوں تو آپ اس سے اسی حد تک واقف ہونگے جس حد تک کے آپ کے اس کے معاملات ہیں۔ اس لئے کہ وہ غیر ضروری چیزوں کو معرض بحث میں نہیں لاتا۔ نہ وہ دوسروں کے حالات معلوم کرتا ہے اور نہ اپنے بیان کرتا ہے۔ یہ اس کے دل کی تنگی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے نوجوان باوجود متعدد سال انگلستان میں رہنے کے شاید ہی کسی گرم اختلاط آدمی سے ملے ہوں جو کھل کر ان سے ملا ہو اور ان کے ساتھ ہمدردی رکھتا ہو اور وقت پر ان کے کام آسکے۔ بالخصوص جنوبی فرانس کے لوگ نہایت ہنس مکھ واقع ہوئے ہیں۔ آپ ان سے چاہے کتنی

غمگین باتیں کریں وہ آپ کو ہنسادینگے اور خود بھی ایسے موقعوں پر ہنستے نظر آئینگے

فرانیسی سخت محنتی اور جفاکش ہوتا ہے۔ پیرس کی گلیوں میں عیش منانے والے باہر کے غیر ملکی ہوتے ہیں۔ اس کو اپنی روٹی کمانے سے اتنی کم فرصت ملتی ہے کہ بجز اس کے کہ وہ دوسروں کے لئے سامان عیش مہیا کرے خود اس میں بہت کم منہمک ہوتا ہے۔ اس کی خوش سلیقگی کا عالم یہ ہے کہ دوسرے خود بخود اس کی طرف راغب ہوتے ہیں۔

فرانیسی عورتیں

فرانیسی عورتیں زیادہ تر گھریلو عورتیں ہیں جو گھروں میں رہتی، بچوں کی دیکھ بھال کرتی اور کھانے پکانے کا کام کرتی ہیں۔ پیرس کی عورتوں کو دیکھکر فرانس کی عام زندگی کے متعلق رائے قائم نہیں کی جا سکتی۔ فرانیسی عورتیں عام طور پر اعلیٰ تعلیم حاصل نہیں کرتیں۔ لیکن سب تعلیم یافتہ ہوتی ہیں۔ یونیورسٹی کی تعلیم صرف وہی عورتیں حاصل کرتی ہیں جو یا تو بدصورت ہوتی ہیں یا عمر میں متجاوز ہونے کی وجہ سے شادی نہ کر سکتی ہوں۔ لڑکیوں میں شادی کی عمر اوسطاً (۱۹، ۲۰) سال کی ہے اس لئے کوئی تعجب نہیں اگر یونیورسٹی میں بدصورت اور زائد عمر کی عورتیں نظر آتی ہوں۔

فرانیسی عورتوں کو ابتک سیاست میں حق رائے دہی حاصل نہیں ہے اور نہ وہ اس کے لئے بے چین ہیں کیونکہ وہ جانتی ہیں کہ جبتک ان کی حکومت مردوں کے دلوں پر ہے ان کو اس کی ضرورت نہیں۔ اس طرح بالواسطہ حکومت ان کے ہاتھوں میں ہے اور ان کی رائے عامہ اپنے گھر کے مردوں کے ذریعہ حکومت کے فیصلوں میں بڑی حد تک دخیل ہوتی ہے۔ یہ دراصل فرانس کے

پیچھے ہونے کی دلیل نہیں کہ اس کی عورتوں کو حق رائے حاصل نہیں ہے بلکہ فرانیسی عورت سیاسی الجھنوں میں پڑ کر اپنی نسوانیت کو تباہ کرنا نہیں چاہتی۔

بالعموم اعلیٰ تعلیم صرف ایسی عورتیں حاصل کرتی ہیں جو آئندہ زندگی میں معلمی یا اخبارات وغیرہ میں کام کرنا چاہتی ہیں۔ دوسرے پیشوں میں عورتوں کو کسی قسم کے موانعات نہیں ہیں۔ اکثر عورتیں شوفر ہیں، ٹرام اور بس چلاتی ہیں اور اب پولس میں بھی بھرتی ہو رہی ہیں۔

فرانیسی محب وطن فرانیسی انتہا درجہ محب وطن واقع ہوا ہے اور اس کی سپہ گری کے معترف جرمنوں سے زیادہ دنیا میں کوئی نہیں۔ وہ نہایت بے جگری سے لڑنے والا ہے جس کا خود جرمن جرنیلوں کو اعتراف ہے۔ اپنے وطن کے لئے جان دینا اس کے لئے ایک ادنیٰ بات ہے۔ سیاست میں عام طور پر اس کو تنگ نظر کہا جاتا ہے کیونکہ وہ ساری دنیا کی سیاست کو اپنی سیاست کے تابع دیکھنا چاہتا ہے۔

ڈاکٹر محمد رضی الدین صدیقی

ڈاکٹر محمد رضی الدین صدیقی یم۔ اے، پی، یچ، ڈی (کنٹب) جامعہ عثمانیہ کے مایۂ ناز سپوت اور ریاضی میں اپنی غیر معمولی قابلیتوں کی وجہ سے ہندوستان اور یورپ میں بے حد مشہور ہیں۔ ۱۹۴۸ء میں انڈین نیشنل اکاڈمی آف سائنس نے ہندوستان میں گذشتہ سات سال کے دوران میں بہترین سائنٹفک کام انجام دینے کے صلہ میں آپ کو ایک طلائی تمغہ عطا فرمایا ہے جو ایک ایسا اعزاز ہے جس پر حیدرآباد اور جامعہ عثمانیہ جتنا فخر کرے کم ہے۔

جرمنی کے قیام کے زمانہ میں آپ نے آئنسٹن کے ساتھ کام کیا ہے اور مسئلہ اضافیت پر آپ نے انگریزی میں ایک کتاب تحریر فرمائی ہے جو زیر طبع ہے۔

آپ ہندوستان کی اکثر سائنٹفک سوسائٹیوں کے فیلو اور بعض معیاری سائنٹفک رسائل کے شعبہ ادارت کے رکن ہیں۔ اس سال

آپ انجمن طیلسانین عثمانیہ کے صدر بھی ہیں۔

آپ کا قیام یورپ میں سنہ ۲۶ء تا سنہ ۳۰ء رہا۔

سنہ ۳۶ء میں بھی آپ یورپ تشریف لے گئے ہیں۔

زندہ قوموں کی خصوصیات

جب سنہ ۲۶ء میں پہلی مرتبہ ڈاکٹر محمد رضی الدین یورپ تشریف لے گئے تو اس وقت یہ براعظم جنگ عظیم کے اثرات سے سنبھالا لے رہا تھا۔ جنگ کی تباہ کاریاں جرمنی اور فرانس میں سب سے زیادہ نمایاں تھیں اور یہی وہ دو ممالک تھے جن کا براہ راست جنگ سے تعلق بھی تھا اور جنگ نے بعد میں ان ہی دونوں کو سب سے زیادہ نقصان بھی پہنچایا۔ عام طور پر یہ خیال کیا جاتا تھا کہ یہ دونوں اقوام یا کم از کم شکست خوردہ جرمنی صفحہ ہستی سے ناپید ہو جائیگا جیسا کہ اس کے قبل یونان، روم اور دیگر اقوام یا تو نابود ہو گئیں یا انتہائی تنزل کی حالت میں ہیں۔ اگر اس صورت حال سے کسی دوسری قوم کو جو طاقت و توانائی میں جرمنی سے کمتر ہوتی اور جو اندرونی انتشار اور بین الاقوامی نزع میں گھری رہتی، دوچار ہونا پڑتا تو اس کی جگہ کوئی اور طاقتور قوم لے لیتی۔

لیکن دس سال کے بعد پھر سنہ ۳۶ء میں آپ کو یورپ جانے کا اتفاق ہوا تو آپ نے دیکھا کہ وہاں پہلے سے بھی زیادہ زندگی کے آثار ہیں۔ اگر مادی نقطہ نظر سے دیکھا جائے تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ یورپ پہلے کی بہ نسبت بہت آگے نکل گیا ہے اور آج بھی پہلے کی طرح سیاسی چالبازیوں اور حکمت عملیوں کا

اکھاڑا بنا ہوا ہے۔ اس کی ساری قوتیں ایک دوسری جنگ کی تیاری کیلئے صرف ہو رہی ہیں اور یہ ایک ایسی جنگ ہوگی جو نوع انسانی کی تباہی کا باعث ہوگی اخلاقی نقطۂ نظر سے جنگ کی خواہ کتنی ہی مذمت کی جائے لیکن اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ صرف وہی قوم لڑ سکتی ہے جو اپنے آپ کو زندہ محسوس کرے۔ ایک مُردہ قوم ہر قسم کی ذلتوں کو برداشت کر لیتی ہے اور اس میں مقابلہ کی ہمت نہیں ہوتی۔ اس مثال سے ایک زندہ قوم کی اُس خصوصیت کو بتلانا مقصود ہے کہ کس طرح وہ ملک کے حوصلہ شکن حالات کے باوجود طاقت بہم پہنچا کر ترقی کی راہ نکال لیتی ہے۔

اجتماعی اِحساس

یورپ کے مختلف ممالک میں اپنے کئی سال کے قیام کے دوران میں ڈاکٹر محمد رضی الدین کو جس چیز نے سب سے زیادہ متاثر کیا وہ اہل یورپ کا اجتماعی احساس ہے — سب کو ایک کا خیال اور ایک کو سب کا۔ اِنفرادیت کو بالکل قربان نہیں کر دیا جاتا اور جبتک مفاد عامہ سے اِنفرادیت متصادم نہیں ہوتی اس کو ترقی دیجاتی ہے۔ انانیت کو سوسائٹی برداشت نہیں کرتی اور ہر قسم کی حکومتیں شہنشاہیت سے لیکر جمہوریت تک اس کو کُچلنے کی کوشش کرتی ہیں۔ اگر کسی شخص نے ایک معینہ مقدار سے زیادہ دولت جمع کر لی ہو اور وہ بخوشی خیراتی کاموں میں اپنی کچھ رقم نہیں لگاتا ہے تو محاصل کی صورتوں میں اس سے یہ رقم وصول کر لی جاتی ہے۔ راک فیلر، کارینج اور نفیلڈ جیسے لوگوں نے اِتنی خیرات کی کہ ان کا شمار قومی خیر خواہوں میں ہو گیا۔ تقریباً تمام سائنٹفک ترقی

جامعات، تجربہ خانوں اور تحقیقاتی اداروں میں ہوتی ہے جو خانگی اشخاص کے قائم کردہ اور ان کے سرمایہ سے چلائے جاتے ہیں۔ بعض وقت حکومت بھی ان چندوں میں شریک ہوجاتی ہے لیکن یہ بھی محض اس لئے ہوتا ہے کہ خانگی اشخاص کو ترغیب دیجائے۔ مثال کے طور پر جب جامعہ کیمبرج کے کتب خانہ کی از سرِ نو تعمیر کی شدید ضرورت محسوس کی گئی تو حکومت نے اِس شرط پر نصف اخراجات کی پابجائی کا وعدہ کیا کہ آدھی رقم خانگی طور پر جمع کی جائے۔

ایک اور مثال ہے وہ یہ کہ تمام ہسپتال بالکلیہ خانگی چندوں سے چلائے جاتے ہیں۔ اور ایک غریب مزدور بھی جب وہاں علاج کے لئے جاتا ہے تو وہ خیراتی صندوقچہ میں ایک آدہ پیسہ ڈالنا کبھی نہیں بھولتا۔ اگر اُس کا یہ فعل کسی کارِ خیر میں حصہ لینے کی نیت سے نہ بھی ہو تو کم ازکم اس کو یہ خیال ضرور رہے کہ ممکن ہے اس کا یہی پیسہ کل اسی کے کام آئے۔ اور ان دونوں صورتوں میں ہسپتال کا فائدہ ہے۔ اس طرح ہسپتال کے اخراجات کے لئے چندے جمع ہوجاتے ہیں۔

اسیطرح سائنٹفک ایجادات واختراعات کے لئے انعامات مقرر ہیں تاکہ کام کرنے والے بیٹھے نہوں اور انہیں کام کرنے کی ترغیب ملتی رہے۔ فنون کی تائید میں کتنا ہی کیوں نہ کہا جائے لیکن اس بیسویں صدی کی دنیا میں کسی قوم کی حقیقی ترقی کا انحصار سائنٹفک ایجادات پر ہے ورنہ اس کے بغیر جاپان کے مقابلہ میں ہندوستان کی سیاسی ومعاشی پستی کی کیسے توجیہ ہوسکتی ہے۔ حالانکہ یہ حقیقت ہے کہ ادب، موسیقی، اور فلسفہ میں

ہندوستان جاپان سے کہیں بڑھ چڑھ کر ہے لیکن ہم مشنری کا تخیل سے مقابلہ کرنے سے رہے۔

رائے عامہ

لیکن محض سائنٹفک معلومات ہی کافی نہیں ہیں۔ نہ صرف ہماری جامعات اور تجربہ خانوں میں بلکہ زندگی کے ہر شعبہ میں سائنٹفک زاویہ نظر کی ضرورت ہے۔ علاوہ ازیں افراد اور جماعتوں کے اعمال پر صحیح رائے قائم کرنے کے لئے ملک میں تعلیم یافتہ رائے عامہ کا پیدا ہونا ضروری ہے۔ مغربی ممالک میں اکثر چیزیں محض اس وجہ سے کامیاب یا ناکام ہوتی ہیں کہ رائے عامہ ان کی تائید یا مخالفت میں ہوتی ہے۔ لیکن رائے عامہ کے لئے عام تعلیم کی ترویج ضروری ہے اور اس کے بعد ہی لوگ اپنے حقوق اور ذمہ داریوں سے آگاہ ہو سکتے ہیں۔ یورپ کے کسی قصبہ کے کوچوں اور ہوٹلوں میں مزدور پیشہ مرد اور عورتوں کو اہم مسائل حاضرہ پر بحث و تمحیص کرتے دیکھنا ایک معمولی سی بات ہے۔ براعظم میں ڈاکٹر محمد رضی الدین کو بارہا اتفاق ہوا کہ معمولی لوگوں نے آپ سے ٹیگور اور ان کی گیتان جلی، مہاتما گاندھی اور ان کی قومی تحریک اور اس قسم کی دیگر چیزوں کے متعلق استفسار کیا۔ ہر یورپ جانے والے کو اس قسم کے تجربات سے سابقہ پڑتا ہے۔

یورپ کی ترقی کا راز

ترقی کوئی جامد و ساکن شئے نہیں ہے اور نہ ترقی کرنے کے کوئی معین اصول ہیں۔ ہر قوم کو اپنی موجودہ حالت کا جائزہ لیکر آئندہ کے لئے ایک لائحہ عمل

مرتب کرنا چاہیئے۔ یورپ کی ترقی کے راز کو کسی ایک ضابطہ کے ذریعہ نہیں بتلایا جا سکتا۔ لیکن اگر کوئی شخص یورپین ممالک کی ترقی کے متعلق اپنے مشاہدات کو مختصر الفاظ میں پیش کرنا چاہیئے تو وہ یہ کہیگا کہ وہ لوگ علم حاصل کر کے اس کی اشاعت کرتے ہیں، اس علم سے قوت حاصل کی جاتی ہے اور اس قوت کو چند افراد کے فائدہ کے لئے نہیں بلکہ پوری قوم کے فائدہ کے لئے اِستعمال کیا جاتا ہے۔

ڈاکٹر سیّد محی الدین قادری زورؔ

ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورؔ یم۔ اے۔ پی ایچ۔ ڈی (لندن) ادبی دنیا میں کسی تعارف کے محتاج نہیں آپ جامعہ عثمانیہ میں اردو کے پروفیسر ہیں۔ ایک بلند پایۂ مصنف، ادیب و نقاد کی حیثیت سے آپ سارے ہندوستان میں مشہور ہیں۔ آپ کی بعض تصانیف اکثر ہندوستانی جامعات کے نصاب میں شامل ہیں۔ آپ حیدرآباد کے مشہور ادارۂ ادبیات اردو کے معتمد عمومی ہیں اور آپ کی سرکردگی میں زبان وادب کے مختلف اصناف پر نوجوان مصنفین کی ایک جماعت کام کر رہی ہے۔

آپ کا قیام انگلستان و فرانس میں ۲۷ء تا ۳۱ء رہا۔

خصوصیات ہندوستانی طالبعلم کا مطمح نظر عام طور پر سفر انگلستان سے جو زیادہ مفید نہیں۔ انگلستان کی تعلیم اس حد تک مفید ہے کہ وہاں کی ڈگریاں ہندوستان میں مستند سمجھی جاتی ہیں اور دوسرے ممالک کی ڈگریوں

کے مقابلہ میں ان ہی کو ترجیح دیجاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حیدرآباد کے نوجوان بھی برطانوی ہند کے طلباء کی طرح زیادہ تر انگلستان جاتے ہیں۔ جس شخص کو انگلستان کے علاوہ یورپ کے دوسرے ممالک مثلاً فرانس، جرمنی، سوئیٹزرلینڈ اور اٹلی میں کافی عرصہ تک رہنے کا اتفاق ہوا ہے وہی اس امر کا اندازہ لگا سکتا ہے کہ ان ممالک کی زندگی میں کیا فرق ہے اور طالبعلم کی ذہنی نشو ونما وہاں کس حد تک متاثر ہو سکتی ہے۔ متذکرہ ممالک کے منجملہ فرانس کی زندگی ہندستان کے طالبعلموں کے لئے انگلستان کے قیام سے زیادہ سودمند ثابت ہوگی۔ انگلستان میں ہندستانی طالبعلم اپنے سر سے اس خیال کو کسی وقت جدا نہیں کر سکتا کہ وہ ایک محکوم قوم سے تعلق رکھتا ہے اور اپنے آقاؤں کے ملک میں شاید غلامی کے طریقے سیکھنے آیا ہے۔ کوئی انگریز خواہ وہ قدامت پرست ہو یا لبرل کسی کالے آدمی کو برابری کی نظر سے دیکھنا گوارا نہیں کریگا۔ اور شاید یہی وہ راز ہے جس نے انگریزوں کی شہنشاہیت کے بھرم کو اب تک باقی رکھا اور آئندہ کیا تعجب ہے کہ یہی اس کے نقصان کا باعث ثابت ہو۔ لیکن جو طالبعلم محض انگلستان میں رہ کر ہندستان واپس آجاتا ہے وہ کبھی محسوس نہیں کر سکتا کہ اہل انگلستان کا تعلق اس کے ساتھ کس قدر حوصلہ شکن ہے۔ بہت سے اصحاب انگلستان کو جاتے یا آتے ہوئے براعظم کے بھی بعض شہروں کا چند دنوں اور بعض وقت تو چند گھنٹوں کے لئے معائنہ کر لیتے ہیں اور وہاں کی بعض ایسی چیزیں دیکھ لیتے ہیں جنھیں ان بڑے بڑے شہروں کے لالچی رہنما ان سے پیسہ

وصول کرنے کے لئے دکھانے لے جاتے ہیں۔ اور یہ حضرات سمجھتے ہیں کہ یہی ان شہروں کی زندگی ہے اور اسی کو دیکھ کر وہ سارے ملک کی زندگی اور معاشرت کے متعلق اندازہ قائم کر لیتے ہیں۔ ایسے ہی مقامات اور اسی قسم کی دلچسپیاں خاص شہر لندن میں بھی موجود ہیں لیکن یہاں یہ باتیں قانوناً جرم ہیں اور خفیہ طور پر جاری ہیں۔ براعظم کے شہروں میں ان پر زیادہ قیود عائد نہیں ہیں۔ لندن کی ان دلچسپیوں سے ہندستانی طالبعلم شاید بہت کم مستفید ہوتے ہیں اس لئے کہ وہ اپنے آقاؤں کے رعب اور قانونی شکنجے کے خوف سے ان باتوں کی طرف کھلم کھلا رخ نہیں کرتے اور یہ سمجھتے ہیں کہ لندن میں ایسی چیزیں موجود ہی نہیں ہیں۔

فرانس کے تعلیمی ادارے جہانتک تعلیمی اداروں کا تعلق ہے پیرس ایک بین الاقوامی مرکز ہے۔ یہاں مصر، شام، ایران، افغانستان، ترکی، سیام، چین، الجزائر اور مراقش وغیرہ کے ہزارہا طلباء سے میل جول اور تبادلۂ خیالات کا موقع ملتا ہے۔ لندن یونیورسٹی میں سینکڑوں ہندستانی طلباء ہر سال شریک ہوتے ہیں لیکن وہاں پیرس یونیورسٹی کی طرح کوئی ادارۂ تمدنِ ہند موجود نہیں ہے۔ پیرس کی سوربون یونیورسٹی کے اس ادارے کا ہر ماہ ایک جلسہ ہوتا ہے جس میں وہ تمام فرانسیسی، انگریز اور ہندستانی اصحاب جمع ہوتے ہیں جنھیں ہندستانی تہذیب و تمدن سے دلچسپی ہے۔ اس مجمع کو صرف طالبعلموں ہی سے تعلق نہیں رہتا بلکہ ہر طبقہ اور ہر خیال کے لوگوں کا (جن میں پروفیسروں، عہدہ داروں، وکلاء،

اور تاجروں کے بھی کافی افراد شریک ہوتے ہیں) دخل ہوتا ہے۔ اِس طرح سے ہندستانی طالبعلم نہایت آزادی اور خوبی کے ساتھ اپنے مسائل، ضروریات اور رجحانات کے متعلق ان ہمدردوں سے تبادلۂ خیالات کر سکتے ہیں۔

یہی حال ادارۂ تہذیب وتمدن اسلامیہ کا بھی ہے۔ یہ ادارہ مذکورہ ادارہ سے زیادہ شاندار، کامیاب اور مفید ہے۔ اس لئے کہ اس میں ہندستان کے طالبعلم کو وہ چیز حاصل ہوتی ہے جو شاید ہی دنیا کی کسی اور یونیورسٹی میں حاصل ہو سکے۔ اس ادارہ میں شرکت کے بعد ایک مسلمان طالبعلم یہ محسوس کرتا ہے کہ پیغمبر اسلامؐ نے حج کے لئے مکہ معظمہ میں دنیا کے ہر خطے سے مسلمانوں کو جمع کرنے کا جو انتظام کیا تھا وہ کن فوائد کی بنا پر تھا۔ اس ادارے کے اجلاس میں ہر اسلامی ملک کے باشندے جمع ہوتے ہیں اور یہیں ایک مسلمان طالبعلم کو معلوم ہوتا ہے کہ اس کے ہم مذہب دنیا کے دوسرے خطوں میں سرسبز وشاداب ہیں یا مصائب سے گذر رہے ہیں۔ ان ہی جلسوں میں وہ تمام اصحاب اور ان کے متعلقین شریک ہوتے ہیں جو کسی زمانہ میں کسی نہ کسی اِسلامی ملک کے حکمران رہ چکے تھے۔ ترکی خاندان شاہی کے افراد، امان اللہ خاں کے بھتیجے، سلطان احمد شاہ سابق شہنشاہ ایران کے متعلقین، مصر والجزائر وغیرہ کے جملہ امراء کی نئی پود سب یہاں ایک دوسرے سے ملتی ہے اور اس طرح سے یہ بکھرے ہوئے موتی ایک دوسرے کو اپنی آب وتاب دکھا سکتے ہیں۔ یہ وہ جگہ ہے جو لندن میں رہنے والا مسلمان طالبعلم خواب میں بھی نہیں دیکھ سکتا۔ اس ادارے کے جلسوں کا پہلے ہی سے

نظام الاوقات مقرر ہو جاتا ہے اور کبھی ایرانی طلباء اور طالبات اپنے مشاہیر شعرا کے کلام سے اہل جلسہ کو لطف اندوز کرتے ہیں اور کبھی مصر و شام یا ترکی و مراقش کے طلباء اپنی ادبیات اور معاشرت کے متعلق دلچسپ باتوں سے مستفید کرتے ہیں۔ ان اداروں میں جو پروفیسر یا حکومت کے عہدہ دار شریک ہوتے ہیں وہ اپنے موضوع کے اس قدر گرویدہ ہوتے ہیں کہ ان نوجوانوں کے ساتھ ان کے تعلقات نہ صرف مساویانہ بلکہ بعض دفعہ ایسے خاکسارانہ ہوتے ہیں کہ یہ طلباء اپنے آپ کو ان سے بلند و برتر سمجھنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ یہ پروفیسر اور دیگر حضرات استفادے کی خاطر آتے ہیں نہ کہ حکومت اور فوقیت جتانے کے لئے۔ اسی طرح ایک انگریز پروفیسر اور ایک فرانسیسی پروفیسر کے برتاؤ میں ہندستانی طالبعلم کو بین فرق محسوس ہوگا۔

جاپان اور حیدرآباد کا مقابلہ میرے اس سوال پر کہ جاپان اور حیدرآباد نے ایک ساتھ مغربی تعلیم شروع کی اور مغربی تمدنی اثرات قبول کئے لیکن ترقی کی دوڑ میں جاپان بہت آگے نکل گیا اور ہم جہاں کے وہیں رہے ڈاکٹر صاحب نے فرمایا کہ اس سوال کا جواب دینے کے لئے سب سے پہلے یہ بات معلوم کرنی ضروری ہے کہ جاپان سے مغربی تعلیم حاصل کرنے کے لئے جو طلباء نکلے وہ کن ممالک میں گئے اور واپس آنے کے بعد کس ماحول میں انھیں کام کرنا پڑا۔ یوں تو دونوں جگہ سے طالبعلم نکلے لیکن ہندستان اور خاص کر حیدرآباد کے طالبعلم کا مطمح نظر آخر تک صرف انگلستان رہا۔ اس کے برخلاف جاپانی طلبا امریکہ،

فرانس اور جرمنی بھی جاتے رہے۔ انگلستان سے حیدرآباد کے طلباء نے انگریزوں کی تنظیمی قابلیت کو سیکھنے کے مقابلہ میں ان کی اس خصوصیت کو حاصل کیا جو حکومت اور شہنشاہیت سے متعلق ہے۔ حیدرآبادی طالبعلم حیدرآباد کو واپس ہونے کے قبل اس حاکمانہ رعونت اور خودپسندی میں ڈوب کر آتا ہے جو وہ انگلستان میں اپنے آقاؤں سے سیکھتا ہے۔ وہ یہ نہیں سمجھتا کہ اگر ایک انگریز اس کو اپنی ماتحت قوم کا ایک فرد ہونے کی وجہ سے کم رتبہ سمجھے تو شاید حق بجانب ہے لیکن وہ اپنے وطن میں آنے کے بعد اس کا غلط استعمال کرنے لگتا ہے اور سمجھتا ہے کہ اپنے غریب ہموطنوں اور اپنے قدیم ساتھیوں کے ساتھ غرور سے ملنا اور حماقت کے آثار ظاہر کرنا اعلیٰ درجہ کا تعلیم یافتہ، خوددار اور مدبر ہونے کی دلیل ہے۔ وہ انگلستان یہ سمجھکر جاتا ہے کہ میں وہاں سے حکومت کے طریقے سیکھ کر آؤنگا اور اس خیال سے نہیں جاتا کہ میں ملک کی خدمت کے طریقے سیکھ کر آؤں۔ جاپانی طلبا پہلے تو انگلستان کو کم جاتے ہیں اور جو جاتے بھی ہیں تو وہ اپنے کو انگریزوں کے ماتحت نہیں سمجھتے اور نہ انگریز ان کے ساتھ آقاؤں کا سا برتاؤ کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ بجائے خواجگی اور بندگی کے شیوں کو حاصل کرنے کے انگریزوں کی وہ خصوصیتیں حاصل کرلیتے ہیں جو ملک و مالک کی خدمت سے متعلق ہوں۔ انگلستان کے علاوہ جو جاپانی طلبہ دوسرے ممالک میں جاتے ہیں انھیں تو ان خصوصیات سے سابقہ ہی نہیں پڑتا۔

جاپانیوں اور حیدرآبادیوں میں بہت بڑا فرق ملکی ماحول کا بھی ہے۔

جاپان اتفاق سے بیرونی اثر و اقتدار سے محفوظ رہا اور حیدرآباد اتنا ہی ان اثرات کا شکار۔ حیدرآبادی طالبعلم انگلستان یا یورپ کے کسی اور ملک سے خواہ کیسے ہی اعلیٰ اوصاف سے متصف ہو کر آئے یہاں آ کر اس کو ایک ایسے ماحول سے سابقہ پڑتا ہے جس میں اسے اپنے ان تمام اوصاف سے ہاتھ دھو دینا ضروری ہے۔ یہاں کے حالات کچھ اس قسم کے ہیں کہ انسان اپنے اصلی جوہر سے محروم ہو جاتا ہے اور اس کو کام کرنے کا موقع ہی نہیں ملتا۔

قومی نصب العین کا تعین

کام کا سب سے بڑا محرک کسی مقصد کا تعین ہے۔ جب تک ملک و قوم کے آگے کوئی خاص نصب العین معین نہ ہو جائے گا اسوقت تک اس کی تمام قوتیں معطل رہینگی۔ اگر ہمارے یورپ جانے والے نوجوانوں کا کوئی نصب العین ہے تو وہ بظاہر اس کے سوا کچھ نہیں معلوم ہوتا کہ اپنے ملک کو واپس ہونے کے بعد کسی اچھے عہدے پر فائز ہو جائیں۔ ذاتی اغراض اور موقتی مفاد کسی قوم کو شاہ راہ ترقی پر نہیں آنے دیتے۔ اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان ہی دو امور کے سوا نوجوان حیدرآبادیوں کے پیش نظر کوئی اور امر نہیں ہوتا۔ اس کی کیا وجہ ہے اس پر بحث کرنے کی ضرورت نہیں۔ جب تک حیدرآباد کے جملہ ارباب اقتدار ایک نصب العین کی طرف نہ بڑھیں گے اور ہر ایک کے پیش نظر سوائے اس خاص سرزمین کی بہبودی اور فلاح کے کوئی اور خیال نہ ہوگا اس وقت تک یورپ سے

تعلیم پاکر واپس شدہ حضرات کی کوششیں تو کیا اگر کوئی شخص آسمان سے بھی کام کرنے کے ولولے اور اہلیت کی صلاحیتیں لیکر آئے تو کوئی فائدہ نہیں ہو سکتا۔ بحالات موجودہ سرزمین دکن کی مثال کانِ نمک کی سی ہے۔ ہر صلاحیت اور ہر خصوصیت اِس میں آکر نمک بن جاتی ہے۔

مولوی حبیب الرحمٰن صاحب

مولوی حبیب الرحمٰن صاحب ایم۔اے، بی۔ایس۔سی (لندن) سررشتہ معلومات عامہ سرکار عالی کے ناظم ہیں۔ اس سے قبل آپ جامعہ عثمانیہ کے شعبہ معاشیات کے صدر اور حیدرآباد اکنامک سوسائٹی کے سرگرم معتمد تھے۔ ہندوستانی اور حیدرآبادی معاشی و اقتصادی مسائل پر آپ کو بڑی دستگاہ حاصل ہے۔ آپ نے اصول معاشیات پر اردو میں ایک کتاب "معاشیات" بھی تحریر فرمائی ہے جو اس موضوع پر ایک بہترین معیاری کتاب ہے۔

آپ کا قیام انگلستان میں سنہ ۲۹ء تا سنہ ۳۲ء رہا۔

خانگی ادارے انگریزوں کی زندگی میں پروفیسر حبیب الرحمٰن کو جس چیز نے سب سے زیادہ متاثر کیا وہ ان کے خانگی اداروں (Voluntary Organisations) کی جدوجہد ہے۔ جب کسی شخص کے ذہن میں

کوئی بات آتی ہے اور وہ سمجھتا ہے کہ ملک و قوم کو اس سے کوئی فائدہ پہنچ سکتا ہے تو انگلستان کی فضا میں اس کا امکان ہے کہ ایسا شخص کچھ اپنے ہم خیال پیدا کر کے اُن کے اتحاد سے ایک خاص جماعت تشکیل دے اور اپنے خیالات کی توسیع واشاعت کے لئے خانگی کوششوں سے عملی تدابیر اختیار کرے۔ بہرکیف وہاں کسی اصلاح یا تحریک کے لئے اس کی ضرورت نہیں کہ وہ سرکاری عہدہ داروں ہی کو سجھائی دے اور حکومت ہی کی جانب سے اس کو عملی جامہ پہنایا جائے۔ ملک میں بیسیوں ایسے ادارے اور خانگی انجمنیں قائم ہیں جو مختلف طریقوں سے ملک کی معاشری خدمت گذاری میں مصروف ہیں۔ ان انجمنوں کے کام کی نوعیت اور مقاصد پر ایک سرسری نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ دنیا کی کوئی چیز جس میں مشترک مفاد اور اجتماعی کام کرنے کا امکان ہو ایسی نہیں جس کے لئے ایک آدھا انجمن قائم نہ ہو۔ پھر خوبی یہ ہے کہ ملک کی یہ تمام انجمنیں ایک مرکزی قومی انجمن کے تحت ہیں جس کو حکومت وقعت کی نظروں سے دیکھتی ہے اور اس کی کارروائیوں کا احترام کیا جاتا ہے۔ اس انجمن سازی سے نام و نمود حاصل کرنے کی کوشش نہیں کی جاتی بلکہ اس کا اولین مقصد ملک کی خدمت اور اراکین میں اتحاد پیدا کرنا ہوتا ہے۔ ان انجمنوں کو سرسبز اور کام کرتا دیکھکر کہنا پڑتا ہے کہ انگریزوں میں اجتماعی طور پر کام کرنے کی کتنی صلاحیت ہے۔ ممکن ہے ہم میں سے بعض لوگ یہ خیال کریں کہ ہمارے افلاس کی وجہ سے ہم اس قسم کے رفاہی کاموں میں حصہ نہیں لے سکتے کیونکہ ان کے لئے سرمایہ کی ضرورت ہے

یہ خیال صحیح نہیں ہے۔ جب ایک بار کوئی کام شروع ہو جائے تو اس کے چل پڑنے کی خود بخود سبیل نکل آتی ہے کیونکہ بے لوث اور بے غرض محنت رائگاں نہیں جاتی۔ علاوہ ازیں ان معاملات میں دلچسپی لینے کے لئے تنہا حکومت کو ذمہ دار قرار نہیں دیا جا سکتا کیونکہ مثل مشہور ہے جیسی روح ویسے فرشتے جیسے افراد ہونگے ویسی ہی حکومت ہوگی۔ اگر افراد کو ان چیزوں کا خیال ہے تو حکومت کو بھی ان کا خیال کرنا ضروری ہے۔

انگلستان میں ابتدائی تعلیم بالکلیہ خانگی اداروں کے ہاتھ میں ہے۔ اس سے ایک طرف حکومت اخراجات سے بچ جاتی ہے تو دوسری طرف اکثر تعلیم یافتہ لوگوں کے لئے معاش کا ذریعہ نکل آتا ہے۔ کیا یہ حقیقت نہیں کہ ہمارے پاس کے اکثر عہدہ دار اپنی ملازمت کی وجہ سے اضلاع پر رہنے مجبور رہیں لیکن ان کے بچوں کی تعلیم کا خاطر خواہ انتظام نہیں ہے بلدہ میں دو ایک اقامت خانے قائم ہو جائیں تو کیا یہ مشکل آسان نہیں ہو سکتی۔

انگریزوں کی خصوصیات

انگریزوں کی ایک اور قابل قدر خصوصیت یہ ہے کہ وہاں کے دولت مند اور ذی ثروت لوگوں میں اپنے ملک و قوم کو فائدہ پہنچانے کا بڑا خیال ہے۔ چنانچہ اخبارات میں روزآنہ وصیتوں کی متعدد اطلاعیں شایع ہوتی رہتی ہیں جن میں خصوصیت سے خیراتی کاموں کے لئے بڑی بڑی رقمیں دیجاتی ہیں۔ لیکن انگلستان اور ہمارے ملک کی خیرات کے طریقوں میں بڑا فرق ہے۔ وہاں اجتماعی خیرات پر زور دیا جاتا ہے اور یہاں انفرادی طریقوں پر۔ خیرات کا مفہوم

سمجھنے میں بھی انگریزوں کے اور ہمارے نقطۂ نظر میں فرق ہے وہ لوگ خیرات خیرات کی خاطر کرتے ہیں اور ہم حصول ثواب اور عاقبت کے خیال سے جس کا یہ نتیجہ ہے کہ ہماری خیرات میں غیر مستحقین زیادہ حقدار ہیں اور ان کی خیرات میں مستحقین۔ مثال کے طور پر کسی درگاہ یا مندر کے لئے کسی جائداد کا وقف کرنا قومی نقطۂ نظر سے کوئی اعلیٰ درجہ کی خیرات نہیں ہے کیونکہ اس میں بجز سجادہ نشین یا پجاری کے بحیثیت مجموعی قوم کو کوئی فائدہ نہیں پہنچتا۔

اسیطرح ہماری اور انگریزوں کی ذہنی کیفیتوں میں بھی بڑا فرق ہے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ زندگی کسی طرح گذر جاتی ہے لیکن وہاں کوشش کی جاتی ہے کہ اچھی طرح گذرے۔ اس کی ادنیٰ مثال یہ ہوسکتی ہے کہ چھٹیاں یہاں بھی ہوتی ہیں اور وہاں بھی۔ فرق اتنا ہے کہ ہماری چھٹیاں ہمارے آرام کے گھنٹوں میں، گپ بازی میں اور اسی قبیل کی دوسری چیزوں میں اضافہ کردیتی ہیں تو وہاں ان کا ہر لمحہ بہترین طور پر صرف کیا جاتا ہے۔ اگر عثمان ساگر یا حمایت ساگر جیسے خوبصورت تالاب انگلستان میں ہوتے تو دیکھتے ان کی کیسی قدر ہوتی۔ ان کے اطراف آبادیاں بس جاتیں، آمد و رفت کے لئے موٹروں اور ٹرام کا انتظام ہوجاتا، دکانیں کھل جاتیں، ہوٹل اور رسٹوران لگ جاتے لیکن یہاں بجز خوش حال لوگوں کے ان تالابوں کا کوئی پرسان حال نہیں ہے۔

عورت یورپ اور انگلستان کی زندگی میں خرابیاں بھی ضرور پائی جاتی ہیں۔ عورتوں کی آزادی کے جو معنی وہاں لئے جاتے ہیں وہ ایک صحت مند معاشرہ کے لئے زیب نہیں دیتے۔ مرد اور عورت

کی معاشی یکسانیت نے اخلاقی نصب العینوں کو تباہ و برباد کر دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یورپ کے جس ملک میں بھی آمریت قائم ہو رہی ہے وہاں عورتوں کے خلاف سخت طرزِ عمل اختیار کیا جا رہا ہے۔ چنانچہ ہٹلر نے عورتوں کو ملازمتوں سے علیحدہ کر کے گھر بٹھا دیا ہے اور ان پر سخت پابندیاں عائد کر دی ہیں

یورپ کی عورتوں کی آزادی کے جتنے قصّے سنے جاتے ہیں وہ جنگ کے بعد کے ہیں اور نتیجہ ہیں جنگ کے معاشی و اقتصادی اثرات کا۔ ورنہ جنگ سے پہلے یورپ کی عورتیں دایرۂ اعتدال میں تھیں۔ ہمارے ملک کے بھی بعض حلقوں میں یہ خیال عام ہو رہا ہے کہ ہماری عورتوں کا پردہ ہماری ترقی میں بڑا سدِ راہ ہے۔ اس کے اٹھتے ہی ساری بندشیں ٹوٹ جائینگی اور ہم بڑی سرعت سے ترقی کے منازل طے کر لینگے۔ یہ محض سراب ہے۔ اس کے لئے خاص ماحول اور خاص حالات کا پیدا ہونا ضروری ہے اور سب سے پہلے تعلیم کی ترویج کی سخت ضرورت ہے۔ بحالت موجودہ ہمارا پردہ ہماری ترقی میں کسیطرح مزاحم نہیں ہے۔

مسز جمال الدین

مسز جمال الدین بی - اے ملک کی ایک روشن خیال خاتون ہیں
آپ نے ۱۹۱۱ء میں میٹرک کامیاب کیا لیکن بلدہ میں کوئی زنانہ کالج نہ ہونے کیوجہ سے
آپ سلسلۂ تعلیم جاری نہ رکھ سکیں - تیرہ سال بعد جب کلیۂ اناث جامعہ عثمانیہ کا
افتتاح ہوا تو باوجود اس کے کہ بیوی اور ماں کی حیثیت سے آپ کی
ذمہ داریوں میں اضافہ ہو گیا تھا آپ نے تعلیم کی طرف توجہ کی اور ۲۸ء
میں بی - اے کامیاب کیا - ۲۹ء میں سرکاری وظیفہ پر یورپ گئیں -
لندن میں فروبل اور اٹلی میں مانٹسوری طریقہ تعلیم کی ٹریننگ حاصل کی -
آپ ماڈل پرائمری اسکول کی صدر معلمہ ہیں -

آپ کا قیام یورپ میں ۲۹ء تا ۳۲ء رہا -

تعلیم | مسز جمال الدین کے خیال میں یورپ کے اکثر ممالک سے بدرجہا
بہتر جاپان ہے جہاں آپ حال ہی میں عالمی تعلیمی کانفرنس ۳۶ء کے

سلسلہ میں حکومت سرکارعالی کے نمائندہ کی حیثیت سے تشریف لے گئی تھیں۔ آپ جاپان، اور اس کے تعلیمی، معاشی و اقتصادی حالات سے اتنی متاثر ہیں کہ آپ مشرق کے اس نوخیز ملک کو یورپ پر ترجیح دیتی ہیں۔

جاپان کے ہر مدرسہ میں ایک شعبۂ صنعت ضرور رہتا ہے۔ بچپن ہی سے بچوں کو مختلف پیشوں اور شنریوں سے واقف کرایا جاتا ہے۔ کنڈر گارٹن میں مشین و آلات سب بچکانی ہوتے ہیں اور بچے بڑے شوق سے ان اشیاء کو استعمال کرتے ہیں۔ ہر مدرسہ میں نہانے کے حوض ہوتے ہیں۔ اور تین تین چار چار سال کے بچوں کو تیرنا سکھلایا جاتا ہے۔ بچوں کی پڑھائی میں کسی وقت نامے کی پابندی نہیں کی جاتی۔ بچوں کو اپنے فطری میلانات کو فروغ دینے کا کافی موقع دیا جاتا ہے۔

جاپان میں لڑکیوں کے لئے ایک فن کاری کا مدرسہ ہے عموماً میٹرک کے بعد لڑکیاں اس میں شریک ہوتی ہیں۔ جو لڑکیاں کالج کا کورس ختم کرنے کے بعد آتی ہیں ان کا نصاب مختصر ہوتا ہے۔ اس مدرسہ میں لڑکیوں کو مختلف کام کاج سکھلائے جاتے ہیں۔

مدرسہ عروسی

جاپان میں ایک اور تعلیم گاہ ہے جس کو مدرسۂ عروسی کہتے ہیں۔ شادی سے قبل ہر لڑکی کو ایک سال یہاں تعلیم حاصل کرنی لازمی ہے۔ اور انہیں ازدواجی زندگی، صنفی معاملات، بچوں کی نگہداشت، بچوں کی بیماریاں، گھر کی صفائی اور اس قسم کی دوسری چیزوں سے واقف کرایا جاتا ہے۔ جاپان میں اس مدرسہ کو اتنی اہمیت حاصل ہے کہ

جبتک لڑکی کے پاس یہاں کا صداقت نامہ نہو اس سے کوئی شادی نہیں کرتا۔

وطن پرستی تعلیم ختم کرنے کے بعد لڑکوں کے لئے دو سال فوجی تعلیم حاصل کرنا ضروری ہے۔ چنانچہ جاپان کا ہر مرد سپاہی ہے خواہ وہ کاروبار کرے، فیکٹری میں ملازم رہے یا کوئی اور کام کرے۔ حالیہ جنگ چین و جاپان کے شروع ہونے کے وقت مسز جمال الدین جاپان میں تھیں اور آپ نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ کس طرح لوگ بغیر کسی وسوسے کے جنگ میں شریک ہوتے ہیں۔ ایک زمانہ وہ تھا کہ جاپانی اپنے بادشاہ کو خدا کے برابر سمجھتے تھے۔ تعلیم اور ترقی کے ساتھ گو آج کل ان خیالات میں اتنی شدت باقی نہیں رہی تاہم وطن پرستی میں جاپانی کا کوئی مقابلہ نہیں کرسکتا۔

بچّے جاپان میں بچوں کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ بچوں کو ہمیشہ ساتھ رکھا جاتا ہے۔ آپ نے یورپ کے اس طریقہ کی مذمت کی کہ ماں باپ اپنی سیر و تفریح کی خاطر بچوں کو یا تو اکیلے گھر میں چھوڑ جاتے ہیں یا ملازمین کے حوالے کر دیتے ہیں جاپان میں بڑے بڑے سینما اور دکانوں میں بچوں کی دیکھ بھال کے لئے ایک ہال رہتا ہے۔ یہاں بچوں کو چھوڑ کر ایک نمبر حاصل کر لیا جاتا ہے۔ اگر بچہ روئے یا بھوکا ہو جائے یا غلاظت کر دے تو نمبر کے حوالہ سے آلہ مکبر صوت پر اعلان کر دیا جاتا ہے۔ نمبر کا قاعدہ مدرسوں میں بھی ہے۔ جو بچے ملازمین کے ساتھ مدرسہ آتے ہیں انھیں مدرسہ کی جانب سے ایک نمبر دیدیا جاتا ہے۔ اگر والدین چاہیں بھی تو بچوں کو اس نمبر کے بتلائے بغیر نہیں لیجا سکتے۔

یورپ کی تقلید مسز جمال الدین کا خیال ہے کہ یورپ کی عورتوں کی تقلید کی ہمیں مطلق ضرورت نہیں — وہاں کی عورتوں کو قومی کاموں میں حصہ لینے کے موقعے حاصل ہیں اگر ہماری عورتوں کو بھی ایسے موقعے ملیں تو ہم سب کچھ کر سکتے ہیں۔ لیکن پبلک امور میں دلچسپی لینے کے ہرگز یہ معنی نہیں ہو سکتے کہ گھر کے انتظام میں انتشار پیدا ہو۔ ان دونوں میں توازن کا برقرار رہنا ضروری ہے۔ جن مخصوص پیشوں یا ملازمتوں میں عورتیں داخل ہو سکتی ہیں وہ تعلیم وتدریس، طبابت اور نرسنگ ہیں۔ اس کے علاوہ دیگر ملازمتیں ہماری عورتوں کے لئے بیکار ہیں۔

پردہ جبتک تعلیم عام نہو اور ملک کے حالات اجازت نہ دیں پردہ کا اُٹھ جانا مناسب نہیں ہے۔ لیکن موجودہ پردے میں کچھ ترمیم ہونی ضروری ہے۔ عورتین نہ بالکل پردے میں رہیں اور نہ علانیہ باہر پھریں۔ ان دونوں کے بین بین رہنا اچھا ہے۔ عورتوں کی صحت وتندرستی کے مدنظر ان کے لئے سیر وتفریح کا انتظام ہونا چاہیئے۔

لڑکوں اور لڑکیوں کی تعلیم میں جو یک نصابی پائی جاتی ہے اس کا ختم ہونا ضروری ہے۔ علاوہ مذہبی تعلیم کے لڑکیوں کی تعلیم میں امور خانہ داری کو زیادہ دخل ہونا چاہیئے۔ ساتھ ہی ہمارے پاس اگر عروسی مدارس بھی قائم ہوں تو اس سے بہت مفید نتائج برآمد ہونگے۔ تعلیم ادہوری ہونے کی وجہ سے لڑکیاں ہر کام میں ادہوری رہ جاتی ہیں۔

ہم تعلیمی ہم تعلیمی کے متعلق مسز جمال الدین فرماتی ہیں کہ

تحتانیہ کی حد تک تو یہ ٹھیک ہے۔ لیکن اس کے بعد اس کی ضرورت نہیں۔ البتہ تحتانیہ تک جن لڑکوں اور لڑکیوں کی تعلیم ایک ساتھ رہی ہے اگر یہی بچے ساتھ ساتھ اعلیٰ تعلیم بھی حاصل کریں تو ان کی ہم تعلیمی جاری رکھی جا سکتی ہے۔

سفر عورتوں کو اگر سفر کے موقعے بہم پہنچائے جائیں تو اس سے ان کو بہت فائدہ حاصل ہوگا۔ سفر سے وسیع النظری اور خیالات میں پختگی پیدا ہوتی ہے اور تکالیف برداشت کرنے سے تجربہ حاصل ہوتا ہے اور دوسرے لوگوں کو دیکھکر اپنی برائیوں اور اچھائیوں پر نظر پڑتی ہے۔

ڈاکٹر محمد حمید اللہ

الحاج ڈاکٹر محمد حمید اللہ ایم۔اے، ال ال۔بی، پی ایچ۔ڈی (بان) ڈی۔لٹ (پیرس) جامعہ عثمانیہ کے ایک مایۂ ناز فرزند اور اس کے شعبۂ قانون کے لکچرار ہیں۔ جامعہ سوبورن (پیرس) نے جس کے آپ ہندوستان میں سرکاری نمائندہ بھی ہیں حال ہی میں اپنے پاس توسیعی تقاریر کے لئے آپ کو مدعو کیا ہے چنانچہ گذشتہ دسمبر آپ فرانس تشریف لے گئے ہیں

آپ نے "اسلامی قانون بین الممالک" کے نام سے اردو میں ایک کتاب شایع کی ہے جو اس موضوع پر پہلی کتاب ہے۔

آپ کا قیام یورپ میں ۱۹۳۲ء تا ۱۹۳۵ء رہا۔

تربیت اطفال جرمنی میں والدین بچوں کو چھ سال کی عمر کے بعد مدرسہ بھیجنے پر مجبور ہیں۔ جہاں ابتدا ہی سے اُنھیں فوجی زندگی کا خوگر بنایا جاتا ہے۔ ہوائی بندوق ان کے ہاتھ میں آجاتی ہے اور ان کیلئے

ایسے کھیل منتخب کئے جاتے ہیں کہ آئندہ چل کر وہ سپاہیانہ زندگی کے لئے تیار رہیں۔

جرمنی میں، بچوں کی تربیت کے لئے Wander Vogel کا طریقہ جس کے لفظی معنی "بھٹکنے والا پرندہ" ہیں، بہت مقبول ہے۔ اس کا یہ مطلب ہے کہ جتنا ممکن ہو کھلی ہوا میں زندگی بسر کی جائے۔ یہ تحریک زیادہ تر نوعمر لڑکوں اور لڑکیوں میں عام ہے۔ حکومت بھی امداد کرتی ہے۔ راتوں میں قیام کے لئے حکومت کی جانب سے ہر آٹھ دس میل پر مکانات تعمیر کر دیئے گئے ہیں۔

کتبخانے؛ فرانس کے سرکاری کتب خانہ کا شمار دنیا کے مشہور کتب خانوں میں ہے عربیات پر اس کتب خانہ میں بہت کم مطبوعہ کتب ہیں۔ یہاں پر ناظرین کو کسی دن تین سے زائد کتابیں نہیں دیجاتیں اور گرمیوں کے زمانہ میں تو (۷۵) فیصد کتب فرمائش کے خلاف لائی جاتی ہیں اور اس غلطی کا خمیازہ ناظر ہی کو بھگتنا پڑتا ہے۔ پیرس میں مشرقی زندہ زبانوں کا ایک قومی کتب خانہ ہے جہاں عربی کے تحقیقاتی کام میں کافی مدد ملتی ہے مگر اس کتب خانہ سے استفادہ کرنے کے لئے خصوصی اجازت حاصل کرنی پڑتی ہے۔ یونیورسٹی کا کتب خانہ ابتر حالت میں ہے۔ پروفیسر من مانی کتابیں لے لیتے ہیں جس کی وجہ سے طلباء کو وقت پر کتابیں نہیں ملتیں۔

جرمنی کے کتب خانے دنیا کے دوسرے ممالک کے کتب خانوں سے بہتر حالت میں ہیں۔ پبلک کتب خانوں میں ایک قسم کا وفاق پایا جاتا ہے اور تمام کتب خانے آپس میں ایک دوسرے کو کتابیں مستعار دیتے ہیں۔ اس کی

فیس بھی برائے نام ہوتی ہے۔ اس طریقہ کو Leihe system کہتے ہیں اس وفاق میں بعض غیر ممالک کے کتب خانے بھی شریک ہیں جیسے روس، آسٹریا کے کتب خانے، کیمبرج اور انڈیا آفس کے کتب خانے وغیرہ۔

جامعات میں شعبہ واری کتب خانے ہوتے ہیں۔ ریسرچ کے طلباء کو کتب خانوں کی کنجیاں دیدیجاتی ہیں۔ بون یونیورسٹی کے کلیہ شرقیات کا کتب خانہ صبح کے سات سے رات کے بارہ بجے تک کھلا رہتا ہے اور طلباء جتنی چاہے کتابیں لے سکتے ہیں اور گھر بھی لیجا سکتے ہیں۔

لیپزگ کے ایک کتب خانہ میں جرمن زبان کی جملہ مطبوعہ کتب موجود ہیں اور یہ اس سرعت سے ترقی کر رہا ہے کہ دس سال کے اندر بلحاظ تعداد کتب یہ یورپ کا سب سے بڑا کتب خانہ ہو جائیگا۔ اس کتب خانے کے دو حصے ہیں:۔ (۱) حصہ کتب (۲) عجائب خانہ جہاں زمانۂ قدیم سے ابتک دنیا کی ہر زبان کی تحریر کے نمونے اور لکھائی سے متعلق جملہ چیزیں مہیا کی گئی ہیں۔

جرمنی میں جامعات اور کتب خانوں کا جو جال پھیلا ہوا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ ۱۸۷۰ء تک جرمنی میں متعدد خود مختار ریاستیں تھیں جو بسمارک کے زمانہ میں ایک وفاق میں منسلک ہوئیں۔ خود مختار ہونے کی وجہ سے ہر ریاست میں ایک جامعہ اور کتب خانہ کا ہونا ضروری تھا۔ جرمنی میں مشرقی علوم و فنون سے غیر معمولی دلچسپی کی بھی ایک خاص وجہ ہے۔ جب جرمنی کے مشہور مستشرق اور جامعۂ بون کے عربی کے پروفیسر مسٹر سی۔ ایچ۔ بکر وزیر تعلیمات مقرر ہوئے تو انھوں نے مشرقی علوم کی طرف زیادہ توجہ صرف کی۔

اس خدمت جلیلہ سے سبکدوش ہونے کے بعد مسٹر بکر نے پھر پروفیسری قبول کر لی تھی۔ ان کا ۱۹۳۳ء میں انتقال ہوا۔

مشرقی ذخائر کی سرگذشت

ابتداء سے عیسائیت کو اسلام سے رقابت رہی ہے اور یہ گویا عیسائی پادریوں کے فرائض میں داخل تھا کہ جس طرح چاہیں اسلام اور آنحضرت صلعم کو بدنام کریں۔ قرون وسطیٰ میں یورپ نے اس موضوع پر اس قدر لٹریچر تیار کیا کہ دو فرانسیسی مصنفوں کی کتاب Roman de Moamet آج تک مشہور ہے۔ اس میں آنحضرت صلعم کے خلاف جملہ اتہامات کو جمع کر کے اُنہیں ایک انتہائی دلچسپ پیرائے میں پیش کیا گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یورپ میں ابتک اسلام کے متعلق عجیب وغریب روایات مشہور رہیں۔

لیکن جب سے کہ یورپ تہذیبی اور تمدنی حیثیت سے ترقی کرنے لگا تو اسلام کے خلاف ایک دوسرا تہذیبی حربہ اختیار کیا گیا۔ اور یہ اسلامی ادبیات کی طرف توجہ تھی۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ یورپین ممالک کا رفتہ رفتہ مشرق پر تسلط بڑھتا جا رہا تھا اور ہر جائز وناجائز طریقے سے مشرقی علوم وفنون کی کتابیں حاصل کرنے کی کوششیں کی جا رہی تھیں۔ اس کے بعد دوسرا قدم جو اٹھا وہ اسلامیات کی تعلیم کے لئے مدارس اور درس گاہوں کا قیام تھا۔ اس معاملہ میں ہالینڈ سب کا پیشرو ہے جس کا سب سے پہلے جاوا پر قبضہ ہوا۔ ان مدارس کے فارغ التحصیل طلباء نے جو عام طور پر دینیات کے طالبعلم ہوا کرتے تھے، اسلام پر علانیہ اعتراضات شروع کئے لیکن زمانہ کے حالات بدلنے سے یہ طریقہ بھی کارگر

اس معاملہ میں بیچارے ہندوستانی مفت بدنام ہیں۔
نازی حکومت نے قومی اشتراکیت کے اصول پر نئے نئے قوانین نافذ کئے جس کے بموجب مملکت کو ہر معاملہ میں فوقیت دیگئی اور اس کے لئے ایک نئی اصطلاح Totalitarian وضع کی گئی۔ سب سے پہلے پریس پر احتساب قائم ہوا اور اس کو حکومت کی تائید پر مجبور کیا گیا۔ یہودی سرکاری ملازمت سے علیحدہ کئے گئے۔ ان کی تجارت اور کاروبار کا مقاطعہ کیا گیا اور ان کی دکانوں پر چوکسی کی جانے لگی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ چند ہی ہفتوں میں سینکڑوں یہودیوں نے دیوالہ نکال دیا۔ بالآخر انھیں ملک چھوڑنے پر مجبور کیا گیا اور عام طور پر یہ قانون نافذ کر دیا گیا کہ کوئی شخص جرمنی چھوڑتے وقت اپنے ساتھ ایک ہزار پونڈ سے زائد نہیں لیجا سکتا۔ آج کل یہ قواعد اور بھی سخت کر دیئے گئے۔ غرض اس طرح ملک کی معاشی اور اقتصادی حالات پر قابو حاصل کیا گیا۔

چونکہ معاہدۂ ورسائی سے جرمنی میں اسلحہ سازی اور فوجی قوت پر تحدید قائم کی گئی تھی لہذا سیول ہوابازی کو ملک میں غیر معمولی فروغ دیا گیا اور ایسے ہوائی جہاز بنائے جانے لگے جو باسانی جنگی جہازوں میں تبدیل ہو سکتے تھے۔ علاوہ ازیں خفیہ اسلحہ سازی کی طرف توجہ کی گئی اور دو سال کی قلیل مدت میں جرمنی کی جنگی قوت فرانس کے برابر ہو گئی۔

ابتدا ہی سے حکومت کے پیش نظر ملک کی معاشری اور اخلاقی اصلاح کا بھی مسئلہ تھا۔ چنانچہ برہنہ کلب بند کر دیئے گئے، تھیٹروں میں عریاں مظاہروں کی ممانعت کی گئی اور یہ مشہور کیا گیا کہ یہ سارے یہودی ادارے تھے۔

اُن تمام عورتوں کو ملازمت سے علیٰحدہ کیا گیا جن کے شوہر برسرِ کار تھے۔ ملک کے ہر اخبار میں پروپگنڈے کے طور پر یہ سرخی قائم کی گئی "جرمن عورت سگریٹ نہیں پیتی" ورنہ جنگ کے بعد عورتوں میں سگریٹ اور منشیات کا عام رواج ہو گیا تھا۔

مختصر یہ کہ نازی تحریک سے جرمنی کے تنِ مردہ میں جان پڑ گئی۔ لیکن جرمن قوم ساری دنیا میں بدنام ہو گئی جس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ یہودیوں نے جو اکثر یورپی ممالک و امریکہ میں صحافت پر چھائے ہوئے ہیں جرمنی کو بدنام کرنے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا۔ ایک اور وجہ یہ بھی ہے کہ یورپی ممالک کو جرمنی کی بڑھتی ہوئی فوجی قوت کے خلاف دنیا کی رائے عامہ کو متاثر کرنے کا زرین موقع ہاتھ آیا۔

جرمنی کی یہ ترقی تاریخ عالم کا ایک زبردست واقعہ ہے کہ کس طرح ایک مفلوک الحال قوم جو تباہی کی سرحد کو پہنچ چکی ہو محض اپنے عزم و استقلال کے بل بوتے ایک قلیل عرصہ میں اپنی کھوئی ہوئی عظمت حاصل کر کے پھر از سرِ نو دنیا کی طاقت ور ترین قوت بن جاتی ہے۔

عورت فرانس میں عورتوں کو بناؤ سنگار کا بڑا شوق ہے۔ آئے دن فیشن میں تبدیلی ہوتی رہتی ہے۔ اس معاملہ میں انگریزی عورتیں بہت پیچھے ہیں البتہ لباس کی حد تک ان کے مرد موزونیت اور فیشن کا بڑا خیال رکھتے ہیں۔ انگلستان میں ادھیڑ اور بوڑھی عمر کی عورتوں کو چہرے پر غازے اور سرخیاں لگانے کا بڑا شوق ہے۔ فرانس کی

عورتوں کے بناؤ سنگھار سے یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ وہ بد اخلاق ہوتی ہیں۔ یورپ کے دار السلطنتوں میں پیرس کے شرفاء کی زندگی بہترین ہے اور انگلستان کے مقابلہ میں عورتوں کا کردار زیادہ تر عفت مآبی کی طرف مائل ہے۔ فرانس میں ایک کنواری لڑکی بجز مدرسہ یا کالج جانے کے باہر تنہا نہیں جا سکتی، اس کے کسی قریبی عزیز کا ساتھ رہنا ضروری ہے۔ یورپ کے ہر ملک میں اعلیٰ تعلیم یافتہ یا جامعہ کی طالبات اخلاقی معاملات میں اپنے آپ کو زیادہ پابند نہیں سمجھتیں۔ تعلیم، آزاد خیالی اور عمر کے تجاوز کر جانے سے عصمت کا تصور باقی نہیں رہتا۔ ضبط تولید کے انگلستان میں زیادہ حامی ہیں۔ فرانس، جرمنی اور اطالیہ میں کثرت اولاد کی تحریک کو حکومت کی سرپرستی حاصل ہے۔

اطالیہ میں ایک نوجوان عورت کا تنہا سفر کرنا بے حد مخدوش ہے۔ ڈاکٹر حمید اللہ کے ایک دوست کی منگیتر اپنے والد کے انتقال کی وجہ سے اپنا غم غلط کرنے ڈیڑھ دو ماہ کے قیام کے ارادہ سے اطالیہ گئی تھی لیکن پندرہ روز ہی میں وہ واپس آگئی۔ معلوم ہوتا ہے کہ قدیم رومنوں کی شہوت پرستی ابتک وہاں کے چپہ چپہ میں سرایت کی ہوئی ہے۔

فرانس میں لوگ کثرت سے شراب پیتے ہیں حتیٰ کہ چھوٹی عمر کے بچے بھی دختِ رز کے شیدائی ہیں۔

معیار زندگی

یورپ کا معیار زندگی بہت بلند ہے اور یہ محض دولت کی فراوانی کی وجہ ہے انگلستان میں ادنیٰ ملازمین کی تنخواہیں معقول ہوتی ہیں جس سے احساس فرض و دیانت باقی رہتا ہے۔ یورپ میں

ایک ٹائپسٹ عورت کو اوسطاً دو سو روپئے ماہوار ملتے ہیں۔ لیکن خرچ کا بھی یہی حال ہے۔ ڈاکٹر صاحب کو ایک مرتبہ اپنی شیروانی کی دھلوائی کے لئے تقریباً پانچ روپیہ ادا کرنے پڑے تھے۔ وہاں کے ادنیٰ ادنیٰ لوگوں میں جو دیانت اور اپنے فرائض کا احساس ہے اس کا اندازہ اس واقعہ سے ہو سکتا ہے۔ بوّن (جرمنی) پہنچنے کے قبل ڈاکٹر صاحب کو کولون اسٹیشن پر ریل تبدیل کرنی پڑی۔ آپ نے قلی کو تین ڈاک اٹھانے کی اُجرت ایک مارک (= یکصد فنش) دی۔ یہ جانتے ہوئے کہ ڈاکٹر صاحب اجنبی ہیں قلی نے اپنی حقیقی اجرت لیکر (۷۰) فنش واپس کر دیئے۔

ذاتی خصوصیّات

یورپ کے ہر ملک کے حالات دوسرے سے مختلف ہیں جرمنی میں ڈسپلن بہت زیادہ ہے اور لیڈر کی اندھادھند تقلید کی جاتی ہے۔ فرانس میں اِنفرادیت زیادہ ہے۔ فرض شناسی اور باقاعدگی انگریزوں کی گھٹی میں پڑی ہے جس کی وجہ سے یہ قوم زندہ بھی ہے۔ لیکن مہمان نوازی، ہمدردی اور عام اخلاق میں کوئی ملک جرمنی سے بازی نہیں لیجا سکتا۔ اس کی توضیح ڈاکٹر حمید اللہ نے ان واقعات سے فرمائی۔ پہلی مرتبہ آپ بون رات کے بارہ بجے پہنچے۔ آپ یہاں کسی سے واقف نہیں تھے۔ آپ کی پریشانی کو دیکھکر آپ کے ایک ہم سفر نے ایک ہوٹل میں لیجا کر ٹھہرایا اور سارے اِنتظامات کر دیئے۔ رخصت ہوتے وقت اس نے جو جملہ کہا اس نے ہمیشہ کے لئے آپ کو اس شخص کا ممنون احسان کر دیا۔ "اگر آپ میرا شکریہ ادا کرینگے تو مجھے تکلیف ہوگی۔"

اِسیطرح اپنی تعلیم ختم کرنے کے بعد جب آپ بوّن سے روانہ ہونے لگے تو

ٹرین رات کے تین بجے نکلتی تھی لیکن آپ کے پروفیسر آپ کو اسٹیشن پر چھوڑنے آئے تھے۔ اس کے برعکس فرانس میں آپ کا ایک سال سے زائد قیام رہا لیکن کسی پروفیسر نے ایک وقت بھی آپ کو چاء پر مدعو نہیں کیا حالانکہ بوؔن میں آپ اکثر پروفیسروں کے پاس ڈنر پر مدعو رہا کئے۔

فرانس میں سرکاری ملازمین کی تنخواہیں بہت کم ہیں اور محاصل زیادہ ہیں، اسی لئے آسانی سے لوگ قوم فروشی پر آمادہ ہو جاتے ہیں۔ آئے دن وہاں راز کی کارروائیوں کا افشا ہوتا رہتا ہے۔

جرمنی میں کسی غیر ملکی کا تین ماہ سے زائد قیام رہے تو پولس میں اپنا پتہ لکھانا پڑتا ہے، فرانس میں بھی یہی اصول ہے۔ علاوہ ازیں وہاں ایسے اشخاص کو ننگے سر اپنی پانچ تصویریں داخل کرنی پڑتی ہیں۔ فرانس میں متوطن ہونے کیلئے فیس مقرر ہے۔ طالبعلموں کو جو کسیطرح کماتے نہوں (۲۰) فرانک ادا کرنے پڑتے ہیں۔

مذہب مذہبیت سب سے زیادہ اطالیہ میں پائی جاتی ہے۔ اس کے بعد فرانس ہے جہاں گرجے لوگوں سے بھرے رہتے ہیں۔ یہاں کے گرجوں میں کرسیوں پر بیٹھنے والوں سے کچھ رقم بھی بطور محصول وصول کی جاتی ہے۔ جرمنی میں بھی راسخ الاعتقادی زیادہ ہے انگلستان میں ہندوستان کے تعلیم یافتہ لوگوں کی طرح لوگ اپنے آپ کو مذہب پرست کہتے ہوئے شرماتے ہیں۔ لیکن مذہب کے یہ بڑے پکے ہوتے ہیں انگریزوں نے سیاست میں ظاہر داری کا جو سبق سیکھا ہے وہ ان کی زندگی کے ہر پہلو پر

حاوی ہے۔

برتری کے اسباب ہر قوم کی ترقی کا ایک زمانہ ہوتا ہے جس کے لئے قدرتاً کچھ اسباب بھی مہیا ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ انگریزوں کا ہندوستان پر جیسا قبضہ ہوا اس سے تاریخ کا ہر طالبعلم واقف ہے۔ اسیطرح مسلمانوں کی (۱۲۰۰) کی ایک قلیل جماعت نے محض اپنے عزم و استقلال سے اسپین پر فتح حاصل کی تھی اور (۸۰۰) سال تک مسلمان وہاں حکمران رہے۔ یورپ اور مسلمانوں کی ترقی کا مقابلہ کرتے وقت یہ امر ذہن نشین رکھنا چاہیئے کہ مسلمانوں نے اس وقت ترقی کی جب ان کے پاس ایک خاص تہذیب تھی یعنی اسلامی تعلیمات۔ لیکن یورپ میں تہذیب و تمدن اس وقت پیدا ہوا جب مادّی حیثیت سے یورپ نے خاطر خواہ ترقی حاصل کر لی۔ یہی وجہ ہے کہ مسلمان ابتداء ہی سے اخلاق، رواداری، ہمدردی اور دیگر خصوصیات میں دنیا کے سامنے مجسم نمونہ بنکر پیش ہوئے اور یورپ میں یہ چیزیں اس وقت شروع ہوئیں جب اس نے ترقی کے جملہ منازل طے کر لئے۔

قابل تقلید خصوصیات ہر ترقی یافتہ قوم میں بعض خصوصیتیں قدرتاً پیدا ہو جاتی ہیں کاروبار کی ترقی کے لئے اس بات کی ضرورت ہے کہ معاملہ اچھا ہو۔ فوج کے لئے ڈسپلن کی ضرورت ہے۔ سیول سرویس میں شخصی مفاد پر قومی مفاد کو ترجیح دیجاتی ہے۔ جو نوجوان یورپ جاتے ہیں انھیں اپنے ملک کا اچھّا نمونہ بن کر پیش ہونا چاہیئے اور نمونہ ہمیشہ نصیحت سے بہتر ہوتا ہے۔ حیدرآبادی اور خصوصاً سرکاری طور پر جانے والے طلباء

متعلق براعظم میں مشہور ہے کہ یہ بڑے مسرف ہوتے ہیں۔

یورپ کا مستقبل ہر قوم اور تمدن کے لئے ترقی اور تنزل لازم و ملزوم ہیں۔ اور یہ قانون قدرت ہے۔ مسلمانوں کو باوجود اپنی اعلیٰ تہذیب و تمدن کے اسپین خالی کرنا پڑا۔ ممکن ہے ایک دن یورپ کو بھی اسی قسم کے حالات سے دوچار ہونا پڑے۔ یورپ کی ترقی اس کی عالمگیر قوت کا نتیجہ ہے اور اس کی یہی قوت اس کی تباہی کا باعث بھی ثابت ہوگی۔ زوال کی دوسری وجہ جس کا قرآن مجید میں بھی ذکر ہے وہ آپس کا نفاق ہے اور یورپ آج کل نااتفاقیوں کا اکھاڑا بنا ہوا ہے۔

آخر میں ڈاکٹر صاحب نے یہ خیال ظاہر فرمایا کہ یورپ غیر محسوس طور پر اسلام کی آغوش میں آرہا ہے۔ عقائد اور معاشری دونوں حیثیتوں سے۔ یورپ میں سرمایہ داری اور اشتمالیت کی دو بڑی خلیجیں موجود ہیں اور اُن میں اتصال صرف زکوٰۃ ہی سے پیدا ہوسکتا ہے۔ اشتمالیت قانون فطرت کے خلاف ہے۔ اس میں انسان کی تخلیقی قوت کا خاتمہ ہوجاتا ہے۔

خود یورپ اپنے مستقبل کے متعلق امید افزا نہیں ہے۔ یورپ کے مفکرین آئندہ کے متعلق بڑے یاس انگیز خیالات رکھتے ہیں۔ اسلام کی یہ تعلیم ہے کہ "تیار رکھو اپنے مخالفین کے لئے جہانتک ہو اپنی قوت کو" جس کا مفہوم انگریزی میں (BE PREFARED) ہے۔ اور جو قوم تیار رہیگی وہ زندہ بھی رہیگی۔

مولوی محمد صدیق صاحب

مولوی محمد صدیق صاحب ایک جرنلسٹ کی حیثیت سے ہندوستان میں کافی مشہور ہیں۔ آپ بمبئی کرانیکل، ڈیلی کرانیکل اور نیشنل ہیرلڈ کے چیف سب ایڈیٹر تھے۔ اول الذکر اخبار کی ہفتہ وار اشاعت اور فری پریس نیوز سروس کی شاخ دہلی کے آپ ایڈیٹر بھی رہ چکے ہیں۔ کچھ دنوں سے آپ ایک طرح صحافت سے کنارہ کش ہو گئے ہیں لیکن حیدرآباد کے سیاسی معاملات میں آپ کی پُرخلوص دلچسپیاں ناقابل فراموش ہیں ۳۷ء میں شاہ جارج ششم کی تاجپوشی کے وقت آپ انگلستان دو ماہ کے لئے تشریف لے گئے تھے۔

انگریزوں کی ذہنیت انگریزوں کی ذہنیت کے متعلق آپ نے فرمایا کہ ہر انگریز کا یہ ایقان ہے کہ برطانیہ کا ہندوستان پر ایسا مستحکم قبضہ ہے کہ ہندوستان کی کسی قسم کی سیاسی شورش سے

اس تسلط میں ذرا بھی فرق پیدا نہیں ہو سکتا۔ اس خیال کی وجہ یہ نہیں ہے کہ انگریز اپنی فوجی قوت پر نازاں ہیں بلکہ گنجفہ کے ایک اچھے کھلاڑی کی طرح ان کے ہاتھ میں جتنے بھی پتے ہیں ان کو وہ بہترین طریقہ پر کھیلنا جانتے ہیں اور موقع و محل کے لحاظ سے وہ جو بھی چال چلتے ہیں وہ بہترین ہوتی ہے۔ ہندوستانی ذہنیتوں کا انہوں نے اس غائر نظر سے مطالعہ کیا ہے کہ ان کے لئے غلطی کا امکان باقی نہیں رہا۔ اس لحاظ سے ہندوستان کی سیاسی تحریک یا قومی مطالبات میں کامیابی محض ایک چیز سے ہو سکتی ہے اور وہ بین الاقوامی صورت حال ہے۔

یہ ایک عجیب بات ہے کہ انگریز ہندوستانی لیڈروں میں گاندھی جی سے زیادہ پنڈت جواہر لعل سے خائف ہیں۔ اسیطرح ہندوستانی صوبوں میں صوبہ سرحدی اور بنگال کے نام خوف و دہشت سے لئے جاتے ہیں کیونکہ ایک بہمیت کے لئے مشہور ہے اور دوسرا نراجیت کے لئے ہندوستان سے متعلق اگر کسی سے گفتگو ہو تو پہلے سرحد کے متعلق سوال کیا جاتا ہے۔ یہ ایک نفسیاتی حقیقت ہے کہ انسان جس چیز سے ڈرتا ہے اتنی ہی اس کی عزت بھی کرتا ہے۔ اس کا اندازہ اس واقعہ سے ہو سکتا ہے کہ فینسی ڈریس بال میں سرحد کے مرد یا عورت کے سوانگ بھرنے والے عام طور پر انعامات کے مستحق قرار پاتے ہیں۔

طبقہ واری تعصب

انگلستان میں طبقہ واری تعصب بہت ہے۔ معمولی طبقے کے لوگ اونچے طبقوں میں آزادی سے گھل مل نہیں سکتے۔ ہندوستانیوں سے عام طور پر تعصب برتا جاتا ہے اور

جتنا اونچے طبقوں میں جائیے اتنا ہی ہندوستانی اپنے آپ کو کمتر محسوس کرتے ہیں۔ اس کا اندازہ زمانۂ تاجپوشی کے اس واقعہ سے ہو سکتا ہے جبکہ بادشاہ کے چاروں ہندوستانی اے ڈی سی کو جو والیان ریاست ہیں تاجپوشی کے دن ناشتہ پر نظر انداز کیا گیا۔ یہ لوگ وقت مقررہ پر شاہی محل پہنچے لیکن انھیں ایک ایسے کمرے میں بٹھا دیا گیا کہ ناشتہ کے بعد جلوس کے وقت ہی اُن کی یاد ہوئی اور اس کو محض بھول پر محمول کیا گیا۔ ہندوستانی اخبارات میں اس پر کافی احتجاج ہوا لیکن بے سود۔ جو ہونا تھا وہ ہو گیا۔

ایک بنگالی لڑکے کا بھی ایک واقعہ ہے جو گھوش خاندان کا رکن، بے حد حسین اور بہترین ڈانسر تھا۔ تاجپوشی کے زمانہ میں وہ ایک مشہور بال میں جس کی فیس داخلہ ہی تین گنی تھی، شریک ہوا۔ اس کی صورت سے وہ ہندوستانی نہیں معلوم ہوتا تھا۔ اس کے حُسن کو دیکھکر لڑکیاں اس پر ٹوٹنے لگیں۔ چنانچہ ایک لڑکی کے ساتھ وہ ڈانس کر رہا تھا۔ دو راونڈ تک لڑکی اس سے کافی مانوس ہو چکی تھی لیکن جب تیسرے راونڈ میں لڑکی کو معلوم ہوا کہ وہ ایک ہندوستانی کے ساتھ ناچ رہی ہے تو اوس نے عین ڈانس میں اپنے آپ کو اس کی گرفت سے چھڑا لیا۔

عورت

مغربی عورتوں کے متعلق مسٹر صدیق نے کسی قسم کی رائے کا اظہار نہیں فرمایا۔ البتہ ایک دوست کے ساتھ آپ کو سوہو جانے کا اتفاق ہوا جو لندن میں رنگین اقوام کا مشہور اکھاڑہ ہے اور جہاں کے شب خانے پُراسرار ہونے کی وجہ سے بہت مشہور ہیں۔

بڑی سوسائٹی کی انگریز عورتیں یہاں چھپ چھپ کر آتی ہیں۔ اس دنیا میں حبشی مرد انتہائی آؤ بھگت کے شکار رہوتے ہیں۔ ان عیش گھروں میں بجز ارکان کے غیر لوگوں کی رسائی ناممکن ہے۔ اس مقام پر پولس کی سخت نگرانی ہے۔

دفاتر مسٹر صدیق انگلستان کے دفتروں اور ان کی باضابطگی کے بڑے قائل ہیں۔ آپ دفتر نوآبادیات کسی کارروائی کے ضمن میں تشریف لے گئے تھے جس کی پہلے ہی اطلاع دیدی گئی تھی۔ وقت مقررہ پر افسر متعلقہ سے ملاقات ہوئی تو آپ کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب آپ نے دیکھا کہ پہلے ہی ساری کارروائی اس کے پاس سلجھی ہوئی رکھی تھی۔ طے شدہ اور طے شدنی امور کو علیحدہ علیحدہ نوٹ کر لیا گیا تھا اور ان کو پڑھ کر سنانے کے بعد آپ کو صرف طے شدنی امور کے متعلق اپنے نقطۂ خیال کو پیش کرنے کہا گیا۔ اس کے بعد گفتگو کی ساری تفصیل اسٹنوگرافر کو لکھوا دی گئی جس کے ٹائپ کرنے کے بعد کاغذات پر آپ کی دستخط حاصل کر لی گئی اور مناسب کارروائی کا وعدہ کرنے کے بعد آپ کو رخصت کر دیا گیا۔ غرض نصف گھنٹے کے اندر ساری باتیں طے ہو گئیں۔

ضبط و نظم مسٹر صدیق انگریزوں کے ضبط و نظم، عورتوں کی محنت پسندی، پولس کے ضبط راہ اور دکان پر گاہکوں سے حسن سلوک کے بڑے مداح ہیں۔ ایک مرتبہ آپ ایک حیدرآبادی نواب صاحب کے ہمراہ تھیٹر تشریف لے گئے۔ ٹکٹ لینے کے لئے دس پونڈ کا نوٹ بھنایا گیا لیکن تیزی میں باقی رقم حاصل نہ کیجا سکی۔ وقفہ کے وقت آلہ مکبر الصوت پر نواب صاحب کی

شکل و شباہت کے حوالہ سے رقم کے بھول جانے کا اعلان کیا گیا اور اس طرح یہ رقم حاصل ہوئی۔

کفایت شعاری انگریز انتہائی کفایت شعار اور سادگی پسند ہوتے ہیں۔ حتیٰ کہ جو انگریز ہندوستان میں ایک شاندار زندگی بسر کر کے وطن واپس لوٹتے ہیں ان میں بھی "صاحبیت" باقی نہیں رہتی۔ اس کی توضیح اس واقعہ سے ہو سکتی ہے۔ مولوی اکبر علی خاں صاحب بیرسٹر نے زمانہ تاجپوشی میں حیدرآباد کے ایک سابق انگریز عہدہ دار کے اعزاز میں ایک عصرانہ ترتیب دیا تھا جس میں اکثر عمائد مدعو تھے۔ لیکن مسٹر صدیق نے حیرت سے دیکھا کہ معزز مہمان جن کے لئے سارا انتظام کیا گیا تھا چھتری بغل میں دبائے ایک بس سے اتر کر دعوت میں شریک ہوئے۔

ملاقاتیں زمانہ قیام لندن میں مسٹر صدیق نے انگلستان کے اکثر اہل الرائے اور سربرآوردہ لوگوں سے ملاقاتیں کیں جن میں قابل ذکر ارل بالڈون (وزیر اعظم وقت) جارج لانسبری، براکوے، بریلسفورڈ (مشہور مصنف) سر فریڈرک سائیکس، سر ریجنالڈ گلانسی و سر ارنسٹ ہڈسن ہیں۔

ارل بالڈون ارل بالڈون سے آپ کی بالکل اچانک اور اتفاقیہ طور پر انڈیل کینزل میں ملاقات ہوئی جہاں آپ ایک دعوت میں شریک ہونے گئے تھے یہیں وزیر اعظم دو ایک روز کی تعطیلات بسر کر رہے تھے۔ غالباً وقت سے کچھ پہلے پہنچنے کی وجہ سے مسٹر صدیق تنہا اس قدیم محل میں گھوم رہے تھے کہ آپ کی نظر وزیر اعظم پر پڑی جو اپنی اہلیہ کے ساتھ بالا خانہ سے نیچے اتر رہے تھے۔

ایک جرنلسٹ سے کہیں ایسے موقعوں پر غلطی ہو سکتی ہے۔ چنانچہ آپ نے فوراً پیش قدمی کرکے اپنا آپ تعارف کرایا اور اِدھر اُدھر کی باتیں ہونے لگیں جس وقت ارل بالڈون نے فرمایا کہ وہ آرام کی خاطر اس محل میں فروکش ہیں تو مسٹر صدیق نے بیساختہ ہنستے ہوئے کہا کہ اگر آپ کو آرام کے ساتھ ساتھ شہنشاہیت کی خدمت کا بھی خیال ہے تو وائسرائے بنکر ہندوستان تشریف لائیں۔ ارل بالڈون نے اِس جملہ پر ایک قہقہہ بلند کیا۔

لانسبری جارج لانسبری لیڈر حزب الاختلاف و سابق وزیر سے ملاقات کرنے میں مسٹر صدیق کو پہلی مرتبہ بڑی دقت پیش آئی۔ گو وقت مقرر ہو چکا تھا اور وقت سے کچھ پہلے ہی آپ ایک ٹکسی میں روانہ بھی ہوئے تھے لیکن تاجپوشی کے زمانہ میں سڑکوں پر اتنی غیر معمولی آمد و رفت تھی کہ وقت مقررہ کے دو گھنٹے بعد بھی آپ کا منزل مقصود پر پہنچنا ناممکن تھا۔ آپ نے شوفر سے اپنی پریشانی کا اظہار کیا جس نے مشورہ دیا کہ آپ فوراً زمین دوز راستے سے جائیں۔ اِس طرح آپ ٹھیک وقت پر جارج لانسبری کے مکان پر پہنچ سکے۔ لیکن اس ملاقات سے آپ کی تشفی نہیں ہوئی اور جب آپ نے اس کا اظہار کیا تو لانسبری نے کسی صبح اپنے ساتھ چہل قدمی کرنے کے لئے کہا کیونکہ یہی اس کی سب سے بڑی فرصت کا وقت ہوتا ہے چنانچہ مسٹر صدیق کو انگلستان کی اس زبردست شخصیت سے دل کھولکر ملنے کا اتفاق ہوا۔ چہل قدمی سے واپس ہوتے وقت لانسبری نے آپ کو لائنس کافی ہوز میں اپنے ساتھ کافی پلائی۔ مسٹر صدیق کا بیان ہے کہ یہ کافی گھر اتنا معمولی تھا کہ کم از کم حیدرآباد کے اوسط قسم کے عہدہ دار بھی ایسی جگہ آنا اپنی کسر شان سمجھینگے۔

لارڈ ہیلی فاکس لارڈ ہیلی فاکس سابق وائسرائے ہند (حال معتمد امورخارجہ برطانیہ عظمیٰ) سے بھی آپ کی ایک دلچسپ مٹ بھیڑ ہوئی۔ قصر بکنگھم میں انڈین کنٹنجنٹ کی دعوت تھی جس میں باہر کے بھی بہت سے لوگ مدعو تھے۔ انگلستان میں عام طور پر یہ قاعدہ ہے کہ کسی بڑے مکان میں داخل ہوتے ہی اپنی ٹوپی اور بڑا کوٹ ملازم (Valet) کے حوالہ کر دینا پڑتا ہے جو سلسلہ وار انھیں محفوظ رکھتا ہے۔ اور یہاں بھی "کیو" کی پابندی کرنی پڑتی ہے۔ چنانچہ مسٹر صدیق کے پیچھے لارڈ ہیلی فیکس اپنی باری کا انتظار کرتے کھڑے تھے۔ ایک سابق وائسرائے ہند کی اس سے بڑھکر اور کیا عزت کی جاسکتی تھی کہ مسٹر صدیق نے انہیں اپنی جگہ پیش کی۔ لیکن لارڈ صاحب نے یہ کہتے ہوئے انکار فرمایا کہ یہ انگلستان ہے ہندوستان نہیں۔

تمت

نظر کے دھوکے

از

بدرِ شکیبؔ

مصنف کے افسانوں کا مجموعہ ہے۔ افسانے بہ اعتبار فن اور بلحاظ دلکشی و رنگینی انتہائی دلچسپ ہیں جن کو ملک کے مشہور آرٹسٹ مسٹر قیوم نے مصور کیا ہے۔ کتابت، طباعت، کاغذ بہترین قیمت عہ افسانوں سے متعلق ذیل کی تنقیدیں ملاحظہ ہوں:

روزنامہ رہبر دکن ہر افسانہ اس مجموعہ کا دلچسپ ہے۔ پلاٹ کی برجستگی، اسلوب بیان کی دلکشی ان کو نہایت درجہ دلپذیر اور سبق آموز بنا دیتی ہے .... یہ افسانے ہر لحاظ سے نہ صرف اردو ادب میں ایک نئے باب کا اضافہ کرتے ہیں بلکہ ہمارے نوجوان ادیبوں کو اس بات کا درس بھی دیتے ہیں کہ تخییل کی دنیا محض بیرونی ادب سے متاثر ہو کر بے سر و پا تحریروں کے لئے نہیں ہے بلکہ اپنے ماحول میں بس کر اس سے فائدہ اٹھانے کا نام ہے۔

رسالہ "ساقی" دہلی یہ افسانے پلاٹ کے لحاظ سے عمدہ اور طرز بیان کے اعتبار سے دلکش ہیں۔ بعض افسانے مقامی رنگ کی وجہ سے خاص نوعیت رکھتے ہیں "گمشدہ لاش" اور "عارضی شوہر" بہت کامیاب افسانے ہیں۔

ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورؔ ایم - اے - پی ایچ - ڈی (لندن) [پروفیسر اردو جامعۂ عثمانیہ]

یہ افسانے زیادہ تر اچھے ہیں اور مصنف کے تخیل کی پیداوار ہیں۔ ان کا اسلوب صاف و سلیس ہے اور ان میں حیدرآباد کی زندگی کو نہایت دلکش پیرائے میں پیش کیا گیا ہے۔ اس قسم کے افسانوں کی ملک کو ضرورت ہے جن میں زبان کی لطافتوں اور اسلوب کی خوبیوں کے ساتھ ساتھ ملک و قوم کے اخلاق و عادات پر نہایت صحیح نقطہ نظر سے تبصرہ کیا جائے۔

یہ کتاب فن فسانہ نویسی کے معیار سے بھی بہت بلند پایہ ہے۔

مشہور مصنف و افسانہ نگار عبدالقادر سروری ایم - اے - ال ال - بی (لکچرار جامعۂ عثمانیہ)

اس مجموعہ کی سب سے نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ عام اردو قصوں کے مقابلہ میں یہ مجموعہ ایک نئی فضا پیش کرتا ہے .... افسانوں میں ادبیت اور افسانہ پن دونوں کی دلچسپیاں موجود ہیں۔ اس مجموعہ میں تمام قصے عشق و تعشق اور وہم پسندی سے مالامال نظر آتے ہیں ....

مشہور مصنف و ادیب سید محمد ایم - اے

بدر شکیب نے اس کتاب میں چھ دلکش افسانے لکھے ہیں جن میں سے زیادہ تر ان کے اپنے طبع زاد ہیں۔ ان افسانوں میں حیدرآبادی معاشرت اور تمدن کو بڑی عمدگی سے پیش کیا گیا ہے ...... افسانے کی کتابوں سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے یہ نظر کے دھوکے واقع میں بہت نظر فریب اور دلکش ثابت ہونگے۔